غالبؔ شکن ~ دوآتشہ

غالبؔ کی سرقہ بازیوں اور جعل سازیوں کی داستانِ پُرالم کا پرزور بیان

غالبؔ پرستی کی بیجا روش کا قلع قمع کر دینے والی شہکار کتاب

****
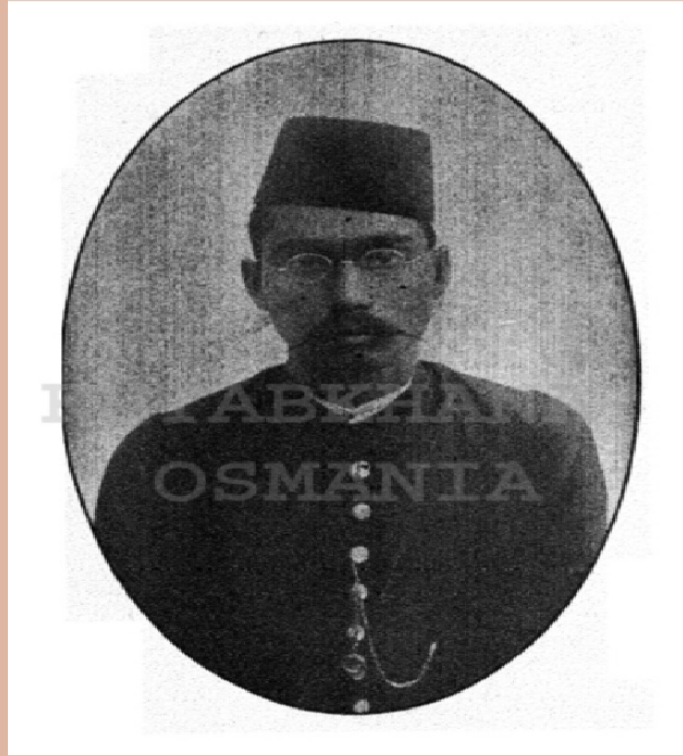
مرزا واجد حسین یاس یگانہؔ چنگیزی عظیم آبادی ثم لکھنوی

غالب شکن
دو آتشہ
یگانہ چنگیزی
۱۹۳۵ء
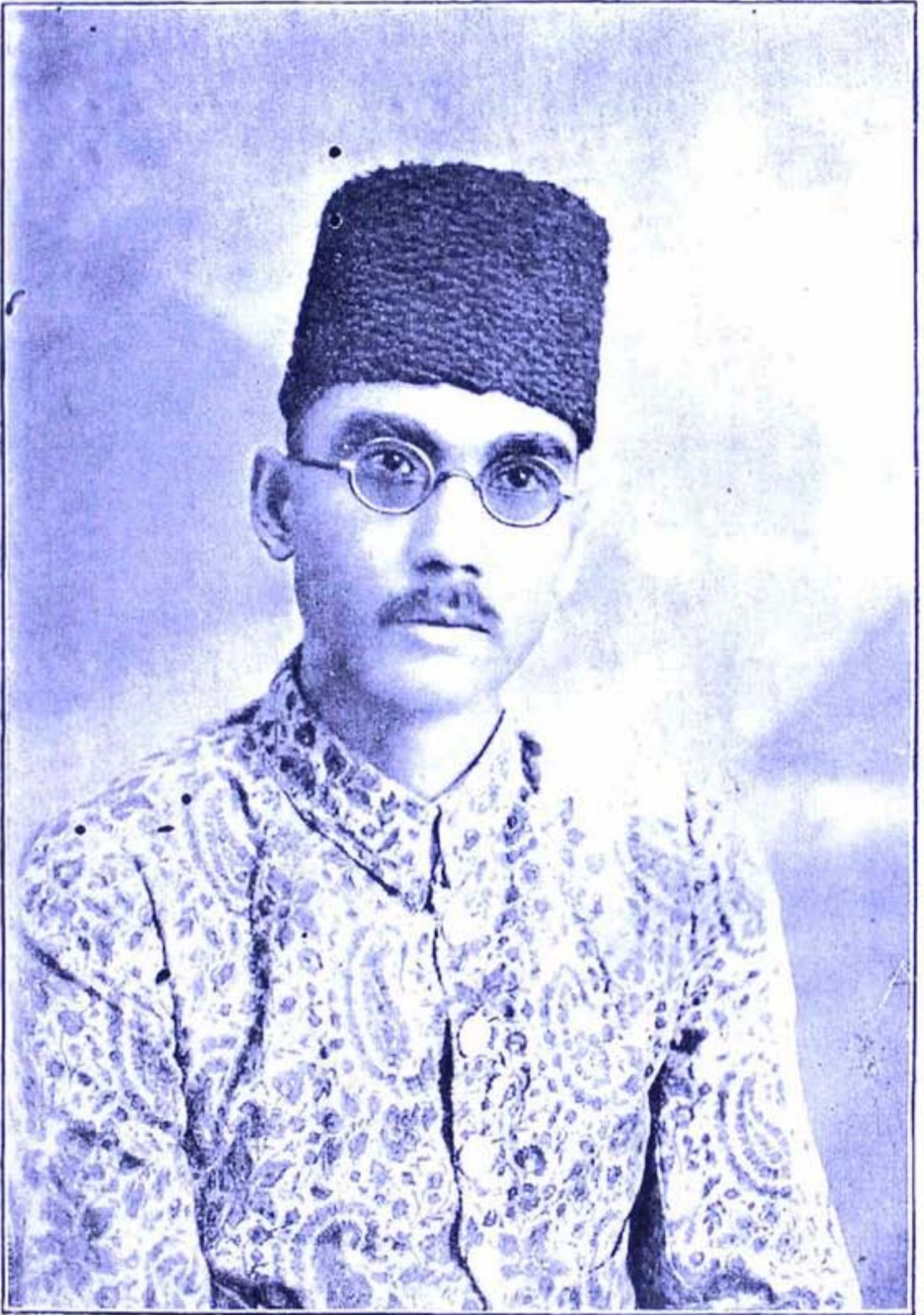
میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی. صاحبِ "آیاتِ وجدانی"

THE ARCH ARTIST-POET OF INDIA.

تحفۂ غالب شکن

بجناب ہیبت مآب ۔ دیوتائے جلال و عتاب

پیغمبر قہر و عذاب

دشمنِ تہذیب پُرفن ۔ حق شناس باطل شکن

مردِ میدانِ بگیر و بزن

شہنشاہِ بنی آدم ۔ سرتاج سکندر و جم

حضرت چنگیز خان اعظم قہراللہ

منجانب

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار لاتور دکن

گرامی نامہ

(۳۱ جولائی سنہ ۱۹۳۵ء)

یکتائے دہر۔ یگانۂ روزگار۔ بعد سلام آنکہ مکتوب ۲۷ ماہ حال مع ہر دو تصانیف پہنچا۔ (راقم) کی ناقد نگاہوں نے اسکے ہر بلند و پست کا جائزہ لیا۔ یگانہ نے یہ اک اہم کام انجام دیا ہے (وہ کون جو شیر تھا اور اب لومڑی نظر آتا ہے) ایسے شاعر کو وسائلِ مضامین کی کیا کمی! سرقۂ مہذّب۔ کِذب مکلّف۔ اختراع محجوب التحریف۔ اتنے آقاؤں کے غلام کو کس بات کی کمی۔ جہاں حُسنِ خطا کا احساس فنا ہو گیا ہو۔ جہاں علوِ خیال کی زندہ مثالیں اسکی معترف اور مؤید ہوں وہاں شاعری کے شعبدوں کی قوت فیصلہ کن کیونکر نظر نہ آتی۔ اب وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ شبستان علم و سخن۔ سلوک و صفا کے دائرے سب اس شمع سے منور نظر آتے ہیں یعنی تصانیف یگانہ سے جو مشعلِ ہدایت بن گئی ہے۔ توہمات کی طغیانی نے جو طوفان برپا کر دیا تھا اب وہ کشتی دریا بُرد ہو گئی۔ یگانہ کے کمال کا سکہ بیٹھ گیا۔ عالم کے حسنِ عقیدت کو نشانہ بنا لیا........ وہ سب عقائد متزلزل ہو گئے۔ وہ زعم کتنا باطل ثابت ہوا۔ آج تک راقم نے کسی شاعرِ حال کی تعریف میں قلم نہیں اُٹھایا۔ اس پر یگانہ کو جس قدر ناز ہو بیجا نہ ہوگا۔ ....
یہ کوئی خط نہیں لکھ رہا ہوں۔ یگانہ کی تنقید کے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ دُعا۔

زندہ باش خوش دل باش

مکتوبِ یگانہ[۱]

(بنام سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی)

لاتور دکن
۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء

مکرمی جناب مسعود صاحب سلام علیکم۔ نوازش نامہ صادر ہوا
خیر آپ نے **ترانہ** کی رسید تو بھیجی (ورنہ یہ تو گویا) ایسی قابلِ نفرت چیز ہے
کہ بہتیرے اصحاب نے رسید تک بھیجنا خلاف اخلاق سمجھا۔ میں پہلے ہی سمجھ چکا
تھا کہ رسید بھیجنا تو کجا بعض اصحاب اسے دیکھ کر جامہ سے باہر ہو جائیں تو کوئی
عجب نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند رباعیاں (وہی جن میں غالب
پر تمسخر کیا گیا ہے) شایع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا۔ انھیں شایع کر کے گویا میں نے
اپنے بہی خواہوں کا (بہی خواہ بقول آپ کے) دل دکھایا ہے۔ خیر یوں ہی
سہی۔ غلط بینی غلط فہمی کے سبب کوئی آپ جی کا کھا جائے تو اور بات ہے
ورنہ مجھے دل دکھانے کی کیا ضرورت۔ البتہ یہ آزمانا ہے کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت
سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔ آیا لوگ اپنے
ہی ہم خیال و ہم مذہب کے ہنر کو دیکھ سکتے ہیں۔ یا غیروں کے بھی میرا مذہب

[۱] نقشِ ثانی میں جا بجا اضافہ کیا گیا ہے اور چوریوں کے ثبوت میں ایک جدید باب بڑھا دیا گیا ہے۔ (یگانہ)

غالب پرستی نہیں ہے بلکہ خود پرستی یا حق پرستی ہے

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
آہ کس دن کیلئے ناحق پرستی کیجئے
(یگانہ)

دوسری ضرورت ان ظریفانہ رباعیوں کی یہ ہے کہ غالب پرستوں کی دیوانہ وار عقیدت اور بہکی ہوئی ذہنیت پر کچھ چوٹ تو پڑے۔ ذرا اپنے حواسوں میں تو آئیں۔ غالب کو ایک دیوتا یا آسمانی شخصیت کی طرح پیش کرکے دنیا کی مہذب قوموں کو ہندوستانی دماغوں پر ہنسنے قہقہے لگانے کا جو موقع دیا جارہا ہے اس پر ذرا غور تو کریں۔ غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال دقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اونٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے۔ پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے مضمون چرانے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا تصرف کی قدرت نہیں رکھتا چوری کھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا۔ ٹھونس ٹھانس کے تک بندی کر لیتا ہے۔

غالب کے ان شاعرانہ نقائص کی طرف گزشتہ بیس سال کی مدت میں بارہا اشارے کر چکا ہوں جو سمجھنے والوں کے لئے کافی تھے مگر اب کچھ ایسی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک مستقل رسالہ مرتب کرکے غالب کی چوریوں اور نقالیوں کو اچھی طرح بکھان ڈالوں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ غالب کے ان عیوب کی

تشہیر کرتا مگر غالب پرستوں کی کورانہ عقیدت نے تمام شعرائے ماضی و حال کے
حقوق چھین کر سب غالب کو دیدیئے ہیں۔ سب کے کارناموں کو فراموش کر کے غالب
کو اردو کا واحد نمایندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ شارحوں اور مضمون نگاروں نے غالب
کی محض مبالغہ آمیز یک رخی تصویر پیش کر کے دکھیہ رخی بھی ایسی نہیں کہ محض حسن کو دکھا
دیا اور عیب کو چھپا دیا بلکہ غضب یہ ہے کہ عیب پر بھی حسن کا رنگ چڑھا کر ملک
میں وہ بدمذاقی پھیلائی ہے کہ اہل نظر حیران ہیں۔ یا الٰہی یہ کونسا طوفان ہے
آپ سمجھتے ہی ہونگے کہ اس بدمذاقی کی ترویج کا کتنا برا نتیجہ مترتب ہو رہا ہے۔ قوم
کی قوّتِ فیصلہ مجروح ہوتی جا رہی ہے تمیز نیک و بد معطل ہوئی جاتی ہے بلکہ ہو چکی
ہے۔ غالب کی لنگڑی شاعری کو بہکی ہوئی ذہنیتیں حسن کمال پر محمول کرنے لگی ہیں۔
لاحول ولاقوۃ۔ جب ایسی گمراہی پھیلی ہوئی ہے تو کیا غالب کی تصویر کا دوسرا
رخ دکھا دینا یا رباعیوں میں کچھ اشارے کر دینا ایک ادبی خدمت نہیں ہے۔ تہِ دل
سے اس خدمت کا اعتراف تو کیا کرتے الٹا الزام رکھا جاتا ہے دل دکھانے کا۔
مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میری خدمتوں کا اعتراف کیا جائے میں خدمت
خدمت کی غرض سے کرتا ہوں حصول صلہ کیلئے نہیں کرتا۔ میں اپنی آنکھوں سے
دیکھ رہا ہوں کہ میری خدمت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا جاتا ہے اور ہوتا
جائے گا مگر میرے حق میں یہ خدمت زحمت و رسوائی کا باعث ہوتی رہی ہے
مجھے دشمن و دوست کی پروا ہوتی تو ایسا کیوں کرتا۔ مگر ملک خود اپنی قوتِ فیصلہ

کو مجروح کئے لیتا ہے یہ کون سی عقلمندی ہے۔ میں غالب کی طرح داد سخن کا بھوکا نہیں پھر لی کہ لوگوں کو منھار کر چمکار کر اپنے ڈھب پر لاؤں یا یہ کہوں تو نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ کمال تو وہ ہے کہ ما رگھونسوں کے داد وصول لیتا ہے۔ تو پھر ضمیر فروشی کرنے یا تالیف قلوب کی منافقانہ پالسی برتنے کی ضرورت کیا ہے داد تو مجھے ایسی ملی کہ زمین و آسمان گواہ ہیں۔ تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آکر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوئے سامنے آنا منھ دکھانا چھوڑ دیا۔ ذرا غور تو کیجئے اس سے بڑھکر داد اور کیا ہوگی؟ بائیکاٹ کا فلسفہ یہی تو ہے کہ رد ندا ہوا دشمن جب ہر طرح عاجز آجاتا ہے کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربہ پر اُتر آتا ہے۔ خدا جانے میرے کرم فرما کون سے قدر دان ہیں جو نفس کمال کو غالب پرستی کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں کیا اچھی شرط ہے کہ میں غالب کی شان میں ایسی ظریفانہ رباعیاں نہ کہتا اُن کے عیب کو بھی ہنر سمجھتا یا کم از کم چھپائے رکھتا تو میرا کمال کمال تھا اور نہیں تو نہیں! عزیزی و شفیقی میرزا اعظیم بیگ صاحب چغتائی اسی بات پر ایک دن اپنے عم محترم (یعنی یہ اور عزیزم مرزا فہیم بیگ صاحب چغتائی کے والد ماجد جناب مرزا ابراہیم بیگ صاحب قبلہ) سے اُلجھ پڑے کہ غالب کیا ہیں میرزا یگانہ تو حضرت عمر اور حضرت ابوبکر کو بھی نہیں مانتے تو اس سے کیا نفس کمال پر کوئی زوال آسکتا ہے؟ اگر یہی بات ہو تو کیا آپ اپنے شیعہ عزیزوں سے رشتہ قطع کر لیں گے؟ یہ سنکر جناب قبلہ ایسے خوش ہوئے کہ خاکسار کی مدح میں برجستہ چند اشعار لکھ ڈالے

جسکی ابتدا اس شان سے فرماتے ہیں ؎

فریدِ وقت ہیں یہ میرزا یگانہ بھی

غرض کہنے کی یہ ہے کہ نفسِ کمالِ غالب پرستی یا شخصیت پرستی پر تو موقوف ہے نہیں۔ کیا اچھے دوست ہیں جو میرے عیب ضمیر پرستی پر تو نظر رکھتے ہیں اور ہنر سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے اس چشم پوشی یا تعصبانہ تنگ خیالی کی کوئی شکایت ہے۔ ہرگز نہیں۔ نہیں یہ چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کا سارا گروہ میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ ہر کس و ناکس کو اپنے ڈھب پر لانا، اپنا چھٹا ہوا خواہ بنانا میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ہر سخن کو جو پرکھ سکتا ہے وہ آپ سے آپ کھنچ آئے گا۔ باوجود ان عیبوں کے جو مجھ میں ہیں ملک میں ایک ایسا بے تعصب تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہے جو مجھے دوست رکھتا ہے۔ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ غالب پرستی کے ساتھ مشروط نہیں سمجھتا۔ خدا جانے یہ مشروط قدردانی کیا بلا ہے۔ جو آل انڈیا شاعر کانفرنس کانپور میں اگر کسی شخص نے میرا یہ مصرع (وہ کون یگانہ ہے وہی غالب چھپا!) نقل کر کے حاضرین جلسہ کو بھڑکایا تو اسکی شکایت کیا۔ اُسکی نگاہ بینی کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ترانہ کے تمام صفحات میں سے آخر کی انھیں پانچ سات مزاحیہ رباعیوں کو کتاب کا ماحصل سمجھتا ہے گویا کتاب کا اصل موضوع یہی چند مزاحیہ رباعیاں ہیں یا کم از کم لوگوں کو ایسا باور کرانا چاہتا ہے۔ تو اُس سے میرا یا آپ کا کیا بگڑتا ہے

ہاں ادبی دُنیا کو اُس نے دھوکا دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس کے اس طرزِ عمل
سے آپ کے ساتھ اور لوگوں کو بھی (جو بقول آپ کے میرے قدردان ہیں)
اور اک ادبی مجمع میں میرے متعلق اس سے بہتر ریمارک سننا چاہتے تھے تکلیف
ہوئی۔ کیوں تکلیف ہوئی؟ یہ اپنی غلط فہمی۔ لوگ کیوں اس امر کے متوقع رہتے
ہیں کہ ہر کس و ناکس اُن کا ہمنوا و ہمخیال ہو جائے۔ کیوں دوسروں سے میری
نسبت "بہتر ریمارک" سننا چاہتے ہیں؟ کیا وہ خود کوئی رائے نہیں رکھتے؟ کیا
اپنی رائے پر انھیں بھروسا نہیں؟ اگر اپنی رائے کو حق بجانب سمجھتے ہیں تو کیا یہ
احساس بجائے خود اک لذت نہیں ہے۔ اگر دوسروں کو بھی اس لذت میں شریک
دیکھنا چاہتے ہیں تو کچھ دنوں صبر کریں انتظار کریں۔ کہ زمانہ خود گرفتاروں کو سیدھا
کر دیگا۔ بھلے کو لوگ خاموشی کے ساتھ میری نسبت "بہتر ریمارک" سننے کے
منتظر رہے خود کوئی کلمۂ خیر نہ کہا ورنہ جوشِ بہی خواہی سے مجبور ہو کر پکار اُٹھتے
تو نہ جانے کیا ہوتا؟ قدر دانی کو ڈالئے بھاڑ میں۔ یہ کیا غضب ہے، کہ مجھ پر
دل دکھانے کا الزام رکھا جاتا ہے اور اس الزام کے ساتھ بہی خواہی کا احسان
بھی جتایا جاتا ہے۔ کیا کہنا ہے اس صفت کرم داشتن کا؟ کیوں حضرت
میں نے دل کیونکر دکھایا؟ چور کو چور بے شرے کو بے شرا کہنا اگر دل آزاری ہے
تو چور کو شاہ بنا کر پیش کرنا اک پیٹ کے بندے خلعت کے بھوکے کو "صوفی"
کا مقدس خطاب دینا۔ سلطنت مغلیہ کے اک خود غرض نمک خوار۔ انگریز دل

کے پرستار وپنشن خوار کو "وطن پرست" ٹھہرانا اور اسی طرح کا بیسیوں سفید جھوٹ اہلِ نظر کی دل آزاری اور پبلک کی گمراہی کا سبب نہیں ہے؟ "غالب شکن" (طبع اول) دیکھکر اک پروفیسر صاحب غالب پرستی کے جنون میں یہ بھی تحریر فرماگیے کہ ڈاکٹر اقبال۔ مولانا محمد علی مرحوم۔ اور مولانا حسرت موہانی نے شاعری کی جو اتنی منزلیں طے کر لی ہیں وہ کس کا صدقہ ہے؟ غالب ہی کا تو فیض ہے۔" بھلا اس دیوانگی کا کیا علاج۔ خدا جانے مولانا محمد علی مرحوم کو شاعری میں کیا اعتبار حاصل تھا؟ اور نہ جانے مولانا حسرت موہانی نے شاعری میں کون سی منزلیں مارلیں؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں کے ایک سچے دیانت دار لیڈر ہونے کے علاوہ مولانا حسرت اچھی خاصی مگر عاشقانہ غزل گوئی بھی کر لیتے ہیں اور اردوئے معلیٰ کے ذریعہ سے اردو کی خدمت بھی کی ہے مگر ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں "عاشقانہ غزل گوئی" کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ شرف جہاں قزوینی اور ہلالی ایران میں اور داغ دہلوی اور جرأت ہندوستان میں کوئی اعلیٰ درجہ کے غزل گو نہیں ہیں۔ غزل گوئی محض مرد و عورت کے جنسی تعلقات یا عاشقانہ زندگی کی ترجمانی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ مشکل ترین صنف ہے جس میں زندگی کے بڑے بڑے اہم مسائل اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کرنے میں اعلیٰ درجہ کی شاعرانہ قوتیں صرف ہوئی ہیں۔ اور یہ اک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مولانا حسرت ایک اوسط درجے کے خوشگو ہونے کے سوا کوئی غیر معمولی

شاعرانہ قوت نہیں رکھتے۔ منزلیں مارنا بڑے لوگوں کا کام ہے۔ اور یہ انکشاف کتنا انوکھا ہے کہ ڈاکٹر اقبال اور مولانا حسرت نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ دیوان غالب ہی کا فیض ہے۔ گویا ان حضرات نے انگریزی فارسی لٹریچر سے کوئی فیض پایا ہی نہیں جو کچھ پایا دیوانِ غالب سے پایا۔ لاحول ۔ اس بوالعجبی کا کیا ٹھکانا ہو۔ اور سنئے آگرہ میں ایک صاحب مجھ سے ملے۔ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کلیجے میں آگ لگی ہوئی ہے فرمانے لگے آپ نے بڑا ظلم کیا یہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے (یعنی غالب شکنی) غالب تو وہ شخص ہے جس کے آگے اردو کے تمام شعرا (نام لے لے کر فرمایا) میر۔ سودا۔ درد مومن۔ ذوق۔ آتش۔ ناسخ۔ انیس۔ دبیر یہ سب بحیثیت مجموعی ہیچ ہیں۔ اور آخر میں "ٹیپ کا بند" یہ تھا کہ جس طرح حضرتِ عمر نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا ڈالنے کا حکم دیتے وقت فرمایا تھا کہ قرآن جیسی کتاب موجود ہے تو پھر دنیا میں کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ اسیطرح میں کہتا ہوں کہ "دیوان غالب کے موجود ہوتے تمام اساتذہ اردو کا کلام سارا اردو لٹریچر آگ لگا دینے کے قابل ہے"۔ خدا جانے یہ جوشِ عقیدت ہے یا دیوانگی؟ غور تو کیجئے اس قسم کی اشتعال انگیز بکواسیں کیونکر برداشت کی جا سکتی ہیں۔ ایسے ہی بکواسوں کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب شکنی ہونے لگی۔ افسوس ہے۔ اس نادان نے غالب پرستی کے جنون میں اس الزام کو بھی تسلیم کرلیا جو حضرت عمر پر کتب خانہ جلانے کے متعلق رکھا جاتا ہے۔ ارے یارو کیا غالب کے لئے یہ شرف کافی نہیں ہے کہ آخر عمر میں (میر تقی میر) کی اقتدا کی

بدولت) وہ اک کامیاب شاعر تھا۔ اگرچہ اس کی عمر کا بیشتر حصّہ ذہنی سرگشتگی و حیرانی میں گذر گیا۔ کیا غالبؔ کی صحیح و جائز تعریفوں سے یاروں کا پیٹ نہیں بھرتا کہ اُسے ناجائز و ناممکن معراج یا "اچھالا" دینے میں یہ مبالغہ کیا جاتا ہے رفتہ رفتہ اس کا انجام یہی ہونا ہے کہ غالبؔ جائز حد تک جس عزت کا مستحق ہے وہ بھی اُس سے چھن جائے۔ اُس کی شاعرانہ بضاعت اُس کے کیریکٹر اس کے طرز زندگی کی سختی سے جانچ ہونے لگے اور آخر کو ہوا بندی کا یہ طلسم جو غلبچیوں نے باندھ رکھا ہے تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ جائے۔ غلبچیوں کے دیوانہ وار عمل کا ردِّ عمل شروع ہو چکا ہے۔ کچھ دلوں میں ثابت ہوا جاتا ہے کہ غالبؔ کو اُردو زبان کا واحد نمائندہ ٹھہرانا اُس کے کلام کو سراسر الہامی اور [illegible] کہنا حاشیہ نویسی و شرح نگاری کا دھندا اختیار کرنا مصنوعی پروپگنڈا ہے ادبی تجارت ہے۔ فارسی لٹریچر سے (جو غالبؔ کا واحد ماخذ ہے کیونکہ وہ فارسی کے سوا اور کوئی زبان جانتے ہی نہ تھے) بے خبری کا نتیجہ ہے۔ جوشِ عقیدت کی فریب کاری ہے۔ مان لیا جائے کہ میں غالبؔ کو سخن دُزد۔ بے سُرا وغیرہ کہنے میں حق بجانب نہ سہی۔ غالب تو کیا بلا ہے۔ خدانخواستہ حضرتِ کرشن کی عظمت۔ مولا علیؑ کی شان جلالت۔ محمدؐ رسول اللہ کی رسالت اور خدا کی وحدانیت سے بھی انکار کر دوں تو کیا حسنِ کمال میں جو تسخیر قلب کی قوت ودیعت ہوئی ہے وہ فنا ہو جائے گی۔ حسنِ کمال کیا خدا پرستی یا غالب پرستی پر مشروط و موقوف ہے۔ کیا

منکروں اور کافروں کو خدا نے اپنی نعمتوں سے مالا مال نہیں کیا؟ ان روشن حقیقتوں کو کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے مگر مبدءِ فیاض کسی کا ذاتی جوہر چھین نہیں سکتا محض اس وجہ سے کہ وہ غالب پرست نہیں ہے۔ فطرت میرزا غالب کی اتنی ہوا خواہ تو نہیں ہے کہ میرزا یگانہ علیہ السلام کا ذاتی جوہر چند ظریفانہ رباعیوں یا "غالب شکن" لکھنے کی وجہ سے مٹا دیگی۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی شاعری کی نسبت لوگوں کی زبان سے "بہتر ریارک" سُننے اور ہر دلعزیز بننے کی ہوس میں تعلیم یافتہ گمراہوں کی طرح ہملاتِ غالب کو بھی آسمانی صحیفہ مان لوں اور اس طرح گمراہ غلیچیوں کی نگاہ میں جھوٹی اور ذلیل عزت حاصل کروں۔ کیا ایسی عزت جو ایک قسم کی بھیک یا رشوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ضمیر فروشی کرکے کوئی بھلا آدمی قبول کر سکتا ہے۔ ٹھوکر پر مارتا ہوں ایسی عزت کو جو غالب پرستی کے صدقے میں حاصل ہو۔ عرفِ عام میں جسے عزّت کہتے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اُس عزّت کو میں نے لکھنؤ میں کس طرح قربان کر ڈالا۔ کیا کیا گالیاں کھائیں مغلّظات۔ کیا کیا ہجویں سُنیں کیا کیا مادی نقصانات اُٹھائے۔ لگی لگائی روزی اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑ دی۔ یہ غالب کا زمانہ نہیں ہے کہ دِلّی کا تخت الٹ جانے کے بعد بڑے بڑے دربار شاعروں کی قدردانی کرنے والے موجود تھے فکرِ معاش کے لئے آجکل سی کشمکش نہ تھی۔ آجکل اپنے وطن میں ساٹھ روپلے کی ملازمت ایک صاحب اہل و عیال کے لئے بڑی قیمتی چیز ہے۔ ایسی

ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کردینا اس زمانے میں دکھ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں کیونکہ شاعری اک سند سمجھی جاتی ہے نکمّے پن کی۔ شاعر گویا عقل وخرد سے بالکل بیگانہ ہے دنیا کا کوئی کام کرہی نہیں سکتا، کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آجکل شاعروں کا کام فقط شعر کہنا نہیں ہے بلکہ بے روزگاری کا عذاب بھی جان کے ساتھ ہے۔ اور اگر کوئی جگہ آسمان زمین کے قلابے ملانے کے بعد مل بھی گئی تو اسکی ذمہ داریاں اور سختیاں اٹھانا بھی ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ نجانے کتنے خداؤں کی پرستش کرنا پڑتی ہے جنگل جنگل مارے مارے پھرو۔ آج یہاں تو کل وہاں رنت نیا پنجرا ینت نیا دانہ پانی۔ ان جھنجھٹوں کے ساتھ فن کو فن کی حیثیت سے کرنا۔ آرٹ کے جانکاہ مراحل طے کرنا کیا کہوں کس قدر مشکل ہے۔ اِس نفسا نفسی کے دَور میں آرٹ کو مرتبۂ کمال پر پہونچانا۔ بغض وعداوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بھینٹ چڑھا دینا بال بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا۔ عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ (اس کے تلف ہوجانے کے رنج وغم کا اندازہ آپ کرسکتے ہیں) بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آکر کوڑیوں کے مول لٹا دینا۔ بال بچوں کو خدا کے حوالے کرکے دیس چھوڑ پردیس پکڑنا۔ پورب پچھم اتر دکھن کٹے کنکووے کی طرح تیّاتے پھرنا۔ اپنی ضمیر پرستی کے ہاتھوں الٹا مورد الزام ہونا۔ یاروں اغیار کے طعنے سننا اور شربت کے گھونٹ کیطرح پی جانا غالب جیسے خودغرض

درباری شاعر پیٹ کے بندے خلعت کے بھوکے انگریزوں کے پرستار و پنشن خوار کا کام نہیں ہے۔ یہ حوصلہ ہے ضمیر پرست اینڈا پسندوں کا جو وجہ معاش کے ساتھ اپنی عزت عزنی کی قربانی بھی اپنے مشن کی خاطر گوارا کر لیتے ہیں اور آجکل کی ہولناک کشمکشِ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ غدر میں فقط قید ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ مجرد جیل چلے گئے تو کون سی ایسی کڑی جھیلی۔ بیوی بچوں کا کچا ساتھ تو تھا ہی نہیں جنکی تباہی و بربادی کا درد و غم وبالِ جان ہو سکتا۔ البتہ شخصی راحت میں خلل پڑ گیا ہو گا۔ اور یہی جسمانی راحت غالب کیلئے بڑی چیز تھی۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ غالب نے چار دن بھی بہادر شاہ کے نمک کا پاس نہ کیا۔ تخت الٹتے ہی انگریزوں کے وفادار نمک خوار قصیدہ گزار بن گئے۔ اک آجکل کے بندگان ادب ہیں کہ زندگی کی ہمت شکن کشمکش کے ساتھ یار و اغیار کے طعنے سنتے ہیں اپنے ہنر پر عیب کا رنگ چڑھتے اور اپنی تصنیفات کے ساتھ مخاصمانہ سلوک دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں ہنستے ہیں کہ یہ مخالفت کتنے دنوں زندہ رہ سکے گی ہم حاسدانِ لکھنؤ کی زبردست جماعت کا وہ زور و شور وہ پروپگنڈا بھی دیکھا اور آخر میں پشیمان ہوتے بھی دیکھ لیا۔ اب غالب پرستوں کا زور دیکھنا ہے۔ خدا نے چاہا تو ان بہکی ہوئی ذہنیتوں کو بھی نادم ہوتے راہ پر آتے دیکھ لوں گا۔ میں نہ دیکھ سکا تو آپ دیکھ لینگے اور اس وقت اپنی رائے بدل دینے پر مجبور ہونگے بغیر سمجھائے آپکی

سمجھ میں آجائے گا کہ میں نے غالب پر جو کچھ بھی تمسخر یا تنقید کی ہے وہ کتنی صحیح اور
کتنی ضروری تھی۔ تو یہی یہ تمسخر بھی اک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے۔ کیونکہ فی الحقیقت
یہ تمسخر کسی عداوت پر تو مبنی ہے نہیں بلکہ ذہنیت عامہ کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ
بھی ہے کہ دل لگتی باتیں دل لگی دل لگی میں کہہ دی جائیں۔ وہ زمانہ کیا آپکو یاد
نہیں جب میرے اس مصرع پر (آبروئے لکھنؤ خاک عظیم آباد ہوں) لکھنؤ میں
قیامت برپا ہو گئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ سنگسار کر دیا جاؤں گا مصرع چونکہ حقیقت
حال کا ترجمان ہے اور نوک پلک سے اتنا درست کہ دلوں میں سوراخ کئے دیتا ہے
اس وجہ سے سارا لکھنؤ بلبلا اٹھا ورنہ کوئی ہوائی بات ہوتی تو ہنسی میں اڑ جاتی
غالب پر بھی جو تمسخر کیا گیا ہے وہ نرا تمسخر تو ہے نہیں۔ پتے کی باتیں ہیں۔ دکھتی رگ
مسل دی گئی لوگ بلبلا اٹھے۔ پانی کہاں مرتا ہے نشیب میں۔ لکھنؤ کی شورشیں کا
کا جو انجام ہونے والا تھا وہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ یہ سب چند روزہ فتنے ہیں
زمانے نے آخر غوغائیان لکھنؤ کے منہ پر کیل دیتے ہوئے ٹھوکر مار دی۔ ملک پر روشن
ہو گیا کون کتنے پانی میں ہے۔ الہ آباد۔ بنارس۔ شاہجہانپور۔ علیگڈھ وغیرہ کے
مشاعروں میں ان لوگوں کی بائیکاٹ بازی کی مذموم کوششوں نے جو کہیں
بن پڑیں اور کہیں نہ بن گئیں آخر یہ دن دکھایا کہ لکھنؤ کا معیار تہذیب و اخلاق
نگاہوں میں سبک ہو گیا اور اسی کے ساتھ لکھنؤ کے ادبی اقتدار پر بھی زوال
آگیا۔ اور اب یہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ میری دیکھا دیکھی ہر کس و ناکس لکھنؤ

منھ آنے لگا ہے۔ بعض ایسے آفاقیوں کو بھی میں نے دیکھا ہے جنکی زبان کی موچ تک نہیں نکلی جنکی مایہ بساط بس اتنی ہے کہ چند عاشقانہ اشعار خوش آوازی سی پڑھکر مشاعروں میں رنگ جمالیا کرتے ہیں اور نام نہاد "مقبولیت" کے فریب میں آکر خود کو کوئی چیز سمجھنے لگے ہیں میرانیس جیسے خدائے سخن کی ٹکسالی زبان پر اپنے جہل کمرب کے سبب منھ آنے لگے ہیں میرانیس کی شاعری کو شاعری نہیں بلکہ شیعیت کا پروپگنڈا کہتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں ہر کس و ناکس کا حوصلہ اتنا کیوں بڑھگیا ہے کب سے بڑھنے لگا اور بڑھتا گیا؟ جب سے میں نے آزادی کی جنگ چھیڑی۔ خود آزاد ہوا اور دوسروں کو بھی آزاد کرایا۔ "چراغ سخن" میں اہل زبان اور زباندان کا فرق فلسفیانہ اصول کے تحت دکھا کر ذہن نشین کر دیا کہ لکھنؤ اور دہلی کے باہر بھی اہل زبان بستے ہیں تب یاروں کو ہوش آیا۔ آنکھیں کھُلیں بیدار ہوئے۔ مگر میرے مسلسل جہاد کا اک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ بہتیرے نااہل بھی آزادی کی ہوس میں مطلق العنان ہو گئے اپنے تئیں بھی کوئی چیز سمجھنے لگے ورنہ اس سے پہلے دوسرے صوبوں کا ذکر کیا خود یوپی والے گوش بر آوازِ لکھنؤ رہتے تھے مگر اب تو گونڈہ بھی آزاد ہو گیا۔ لکھنؤ کے ادبی اقتدار اور مرکزی حیثیت کو زوال میں دیکھکر بیرونجات کے شعراء و اہل قلم کو مطلق العنان پاکر لکھنؤ والوں کو دم مارنے کی مجال نہ ہوئی۔ سون کھینچ گئے۔ البتہ میرے دوست خواجہ عشرت صاحب لکھنوی کا دل دکھا اُنھوں نے بعض ادبی رسالوں میں اس امر پر توجہ دلائی کہ کیوں زبان کا ستیاناس کیا جا رہا ہی لکھنؤ کی

مرکزیت کیوں مٹائی جا رہی ہے۔ زبان کا ایک مرکز ہونا ضرور ہے اور وہ مرکز لکھنؤ کے سوا اور کونسا شہر ہو سکتا ہے"۔ مگر اب کون سنتا ہے ہوا بگڑ ہی تو بگڑ ہی۔ کوئی کیا جانتا تھا کہ لکھنؤ کا بت پندار اس طرح چکنا چور ہو جائے گا!۔

خیر لکھنؤ تو اپنے کیے کو پہونچ چکا۔ اب عالمگیر غالب پرستی کے طوفان کا مقابلہ ہے۔ اس طوفان کا انجام بھی معلوم ہے۔ **آیاتِ وجدانی** اور **ترانہ** عالم شہود میں آچکا ہے غالب کے آسمانی صحیفے کا بھرم کھلتا جاتا ہے۔ اب چچا جان کو بھتیجے کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا۔ برابر چلنے کا موقع نہیں ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب اپنے صحیح مرتبہ سے گر جائیں گے۔ ہاں ناجائز طور پر جو آسمانی خلعت یاروں نے پہنا دیا ہے۔ وہ اتر جائے گا۔ شارحین نے غالب کے ناقص اشعار پر (جو کاٹ کے پھینک دینے کے قابل ہیں) فضول حاشیہ آرائیوں سے ملک میں جو بد مذاقی پھیلا رکھی ہے اور تعلیم یافتہ گمراہوں نے اردو کی دنیا میں مخبط الرجال کی سی شرم محسوس کر کے خواہ مخواہ غالب کو سوانگ بنا کر یونان و جرمنی کے فلاسفروں سے بھڑا دینے کا جو مضحکہ انگیز شیوہ اختیار کیا ہے اسکی ٹھیک نکلنے ہی کو ہے۔ میں نے گذشتہ بیس سال کی مدت میں مختلف مضامین کے ذریعہ سے غالب کی شاعری کے مجروح پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے سوا اُن کے کیریکٹر سے زیادہ بحث نہیں کی جس پر خود اُن کے مکتوبات اور قصائد وغیرہ سے روشنی پڑتی ہے۔ اور "قاطع برہان" تو غالب کی بد لگامی و بد زبانی کی روشن

مثال ہے۔ غالب کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کھری کھری سُنا دینے کی عادت پڑ گئی اس امرِ خاص میں مجھ پر غالب ہی کا پرچھاواں پڑا ہے۔ لوگوں کو میری اس عادت سے نفرت ہے اور ہونی چاہیئے تو غالب سے اور زیادہ نفرت ہونی چاہیئے کہ وہ اس فن (تلخ نوائی) کے امام ہیں سے

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف   آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ غالب کے کیریکٹر پر میں نے کوئی خاص تنقید نہیں کی مگر زمانہ میں عمل کے بعد ردِ عمل کا قانون اٹل ہے۔ پنڈولم اپنی حد کو پہونچکر پلٹا ضرور لے گا۔ غالب شاعروں میں شاعر۔ رئیسوں میں رئیس۔ درباریوں میں درباری صوفیوں میں صوفی۔ رندوں میں رند۔ فلاسفروں میں فلاسفر۔ سپاہیوں میں سپاہی وطن پرستوں میں وطن پرست۔ آخر یہ سب کیا بکواس ہے ان سب سر دیا ہذیانات کو دیکھکر آخر ڈاکٹر عبد اللطیف پی ایچ ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے غالب کے نظریۂ زندگی اور اُن کے کیریکٹر کو تنقید کی کسوٹی پر کسکر دکھا دیا کہ غالب کی حقیقت کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی معرکہ آرا کتاب (”غالب“) پر بہت کچھ چہ میگوئیاں بھی ہوئیں۔ مگر حقیقت آخر حقیقت ہے۔ زبان سے کوئی کتنا ہی انکار کرے حقیقت کا وزن دلوں پر اتنا پڑتا ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔

لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتا چلوں کہ غالب کی شاعری کے کمزور پہلو اور ان کے قابلِ الزام کیریکٹر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں اُن کے جواب میں جو

صفائی پیش کی جاتی ہے وہ کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ کتنا بھولا پن ٹپکتا ہے
غالب پرستوں کے جواب سے۔ غالب کی چوریوں کا جب قطعی ثبوت پیش کردیا
جاتا ہے اور مال مسروقہ بھی سامنے رکھدیا جاتا ہے (یعنی فارسی لٹریچر کا وہ حصہ
جس سے غالب کے بہتر اشعار ماخوذ ہیں یا چرائے گئے ہیں یا بطور ترجمہ اردو کے
قالب میں ڈھال لئے گئے ہیں۔ ترجمہ کہیں بن پڑا ہے کہیں بگڑ گیا ہے اور اتفاقاً
کہیں اصل سے زیادہ چست اور خوبصورت بھی ہوگیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں
یوں کہیئے کہ غالب کے سارے کلام کے متعلق ڈنکے کی چوٹ پر originality
کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے کم از کم یہ دعویٰ تو مال مسروقہ کی موجودگی میں لغو و باطل
ٹھہرتا ہے کیونکہ سیکڑوں برس پہلے سے وہ مضامین فارسی لٹریچر میں موجود ہیں۔
کیا غالب فارسی لٹریچر سے بے خبر تھے کہ ان چرائے ہوئے مضمونوں کو توارد کی
آڑ لیکر غالب ہی کا نتیجہ تخئیل کہا جاسکے؟ البتہ شکسپیر اور ملٹن کے کلام سے
کسی خاص مقام پر توارد ہوجائے تو توارد کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ انگریزی سے
ناواقف تھے۔ یہ بحث جداگانہ موقع پر کیجائے گی کہ غالب کے کن کن اشعار
پر توارد کا حکم لگایا جاسکتا ہے اور کن کن اشعار سے کھلا ہوا بیڈھنگا سرقہ ثابت
ہے۔ اصل و نقل کو سامنے رکھکر حقیقت کھل سکتی ہے) جب مال مسروقہ سامنے
رکھدیا جاتا ہے تو غالب کے وکیل اس الزام کو تو رد کر سکتے نہیں کیونکہ مال مسروقہ
برآمد ہی ہوگیا۔ بڑی غیرت داری بڑی حمیت سے یہ جواب دیتے ہیں۔ جواب

کیا دیتے ہیں سر کی بلا ٹالتے ہیں خفت مٹاتے ہیں کہ ترجمہ و سرقہ وغیرہ کی مثالیں عموماً تمام شعرا کے ہاں پائی جاتی ہیں تو غالب پہ کیا دوش ہے۔ واہ واہ واہ۔ کہاں تو غالب تمام شعراء سے الگ اک آسمانی حیثیت رکھتا ہے اور کہاں عام شعرا کی طرح اُس کے کلام میں بھی چوریاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ کہاں تو سراسر الہام اور originality کے وہ بلند آہنگ دعوے اور کہاں یہ الزامی جواب کچھ بنائے نہ بنی تو دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔ چوریوں کے علاوہ اغلاط فاحش اور بد مذاقی کی مثالیں اس کثرت سے غالب کے ہاں ہیں کہ الٰہی توبہ۔ مگر اُن کے ہوخواہ غلطی کو غلطی بد مذاقی کو بد مذاقی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ گویا غالب تمام حدود فن سے باہر نہیں بالا ہیں!۔ واہ ری اندھی عقیدت! بعض یہ کہنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں۔ مگر یہ الزامی جواب (مبالغہ آمیز دعووں کے سامنے) غلبچیوں کی انتہائی عاجزی کی دلیل ہے۔ غالب کے سر سے الزام اتر نہ سکا تو دوسروں پر بھی الزام رکھدیا۔ اپنے ساتھ اوروں کو بھی سان لیا اے میاں دوسروں سے غلطی ہوتی ہے اور ہو گی کیونکہ وہ انسان ہیں مگر غالب انسان تو ہیں نہیں وہ ٹھہرے آسمانی دیوتا وہ کیوں ایسی ٹھوکریں کھائیں؟ ذرا غور تو کیجئے جب غالب کی شاعری زیر بحث ہوتی ہے۔ تو اس وقت وہ گویا آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے۔ اوروں کا جو آسمان ہے وہ غالب کی زمین ہے۔ (واللہ کیا ہبلے پر کی اُڑاتے ہیں) اُس کا کلام سراسر الہامی ہے۔ آسمانی صحیفہ ہے وغیرہ

وغیرہ جملہ استاتذہ کی سطح سے وہ اتنا بلند دکھایا جاتا ہے گویا وہ اس دنیا کا کوئی
آدمی نہیں ہے۔ کوئی فوق البشر ہستی ہے۔ اُس کا فلسفہ زیر بحث ہوتا ہے (خدا
جانے غالبؔ کا فلسفہ کیا بلا ہے سوا اس کے کہ میرزا بیدل۔ میرزا صائب وغیرہ
کے ہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لیتا ہے اور بس) تو وہ ایک پلّے میں رکھ دیا
جاتا ہے اور یورپ کے تمام فلاسفر دوسرے پلّے میں بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ گویا اتنا
بڑا فلاسفر ہے۔ اس سفید جھوٹ کا کیا جواب۔ خیر ہو گا! ہمیں اس سے کیا مطلب
مگر دل لگی تو یہ ہے کہ جب ایسی فوق البشر ہستی کی کھلی ہوئی بے ڈھنگی چوریاں یا تجیہ
پیش کر دیئے جاتے ہیں تو وہی شخص گویا آسمان سے قلا بازیاں کھاتا ہوا نظر آتا ہے
ہندوستان کے دیگر بے مایہ شاعروں کی طرح چوریوں کا بھی مرتکب ہوتا ہے
فوق البشر کے درجہ سے گر کر بشر ہو جاتا ہے اور ایک حمام میں سب ننگے کا
مصداق ہو کر گویا چوری کے الزام سے بری سمجھا جاتا ہے۔ اسے ہاتھا اللہ تحسین
کے افکار سراسر الہامی اور [illegible] کہے جاتے ہیں وہی دوسروں
کی طرح چوریاں بھی کرتا ہے یعنی وہی کلام مسروقہ بھی ہے اور [illegible] ہوتا ہے
بھی (سبحان اللہ) وہی آسمانی دیوتا عام شاعروں کی طرح غلطیاں بھی کرتا ہے
ٹھوکریں بھی کھاتا ہے اور بضرورت خاص یعنی رفع الزام کی خاطر عام شعراء کے
گروہ کا ایک فرد ٹھہرایا جا کر قابل معافی بتایا جاتا ہے اُس کا عیب تو عام
شعراء کے معیار پر رکھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس کا ہنر گویا خاص الخاص

آسمانی چیز ہے۔ خدا جانے یہ کون سی منطق کون سا فلسفہ ہے؟ یہ ساری منطق ہم
ایسے سیدھے سادے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے وضع ہوئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں
اگر کوئی پیغمبر۔ کوئی فلاسفر۔ عام مجرموں کی طرح گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو کیا اُسکی
وہی سزا ہو گی اُسکے ساتھ وہی رعایت کی جائے گی جو عام مجرموں کے ساتھ
کی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ زیادہ اور بہت زیادہ سزا کا مستحق ہے۔ کیونکہ اُس
کا اخلاق عام سطح سے بہت بالا ہونا چاہیئے۔ پس غالب کی نسبت بے سروپا
اتہام فضیلت کو پیش نظر رکھکر، ان کی شاعرانہ چوریاں۔ درباری شاعروں کی طرح
خلعت فاخرہ کی تمنائیں۔ انگریزوں کی خوشامد نہایت قابلِ نفرت ہیں۔ دوسرے
شعرا چوری کرتے ہیں جھک مارتے ہیں تو غالب جیسے آسمانی دیوتا دوسروں کی
طرح کیوں جھک ماریں۔ اُن کا اخلاق عام سطح سے بالا ہونا چاہیئے تھا مگر
ایسا تو نہیں ہے ہرگز نہیں ہے۔ میر تقی میر۔ میر انیس۔ خواجہ آتش رحمہ کے سامنے
وہ اخلاقی اعتبار سے میرزائیت کے اعتبار سے بہت پست ہیں۔ موخرالذکر
بزرگواروں کی مردانہ وشریفانہ زندگی سے غالب کی خودغرضانہ و بوالہوسانہ
زندگی کا مقابلہ کر دیکھیے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟

شاعرانہ چوری اور کھٹی (قصیدہ بازی) کے علاوہ غالب میں ایک بڑا
نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر اپنی اعلیٰ دماغی استعداد کا صحیح مصرف نہ لے
سکے۔ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں اُن کی ذہنی زندگی کا بیشتر حصہ

میدانی و سرگشتگی میں گذر گیا۔ آج وہ میرزا جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں کبھی نظیری کی۔ کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں کبھی صائب کا۔ کبھی کسی کا کبھی کسی کا۔ زمانہ دراز تک اُن کی طبیعت نے کوئی خاص رنگ پکڑا ہی نہیں۔ کسی مرکز پر قرار ہی نہیں۔ آئے دن رنگ بدلتے رہے۔ آج ایک کو اپنا لیڈر بنایا کل دوسرے کو۔ پرسوں تیسرے کو۔ تنہا پھر خود ان کا کلام سر سے پاؤں تک اسی حقیقت کا شاہد ہے اور یہ شعر تو صاف صاف اُن کے تلون کی چغلی کھاتا ہے سہ

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خدا بھلا کرے نکتہ چینیوں کا جنکے تشدد سے تنگ آکر آخر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا جب کہیں راہِ راست پر آئے چنانچہ اپنے مکتوب میں خود اس امر کا اقرار کیا ہے کہ "میں تو میر کے رنگ میں در آیا اور مومن خاں اپنی راہ چل پڑے۔" یہی آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے۔ غالب کی شاعری کی جان اور اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے اس پر اردو جتنا چاہے فخر کرلے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا! یورپ کی ذہنی روشنی میں غالب کو دیکھنا کتنا غلط اور گمراہ کن اصول ہے۔ بھلا یورپ کی فضا سے غالب کے ذہن کو کیا تعلق؟ غالب کی نشو و نما ہندوستانی اور ایرانی لٹریچر کی فضا میں ہوئی۔ فارسی لٹریچر کی روشنی میں غالب کے کلام پر

صحیح تنقید ہو سکتی ہے ۔ یورپ کے فلاسفروں سے بھڑانا محض اک طفلانہ بوالعجبی ہے
علیگیوں نے فارسی لٹریچر کو تو پس پشت ڈال دیا اور لگے یورپ کی روشنی میں
غالب پر رنگ چڑھانے! فارسی لٹریچر کو سامنے رکھکر تنقید کرتے دکرتے کیونکر؟
انگریزی کے گریجویٹ کو اہل عجم کے کارناموں کی کیا خبر؟) تو کبھی دیوانِ غالب
کو آسمانی صحیفہ سراسر الہامی اور original نہ کہہ سکتے ۔ فارسی لٹریچر
کا سمندر پیر جاؤ تو معلوم ہو غالب کی پونجی کیا ہے ۔ غالب زیادہ سے زیادہ
ہندوستان کا اک بلند خیال دِقّت پسند، گمراہ شاعر ہے جو آخر عمر میں راہ پر آیا ۔
مگر صبح کا بھولا شام کو آ ئے تو اسے بھولا نہیں کہتے ۔ ڈاکٹر عبداللطیف کا یہ
قول صحیح نہیں ہے کہ غالب کوئی بڑا شاعر نہیں ہے ۔ غالب اُردو کا بڑا شاعر
ہے اعلیٰ درجہ کا غزل گو ۔ ایشیا میں بڑا شاعر وہی نہیں ہے جو ملٹن کی فردوس
گم گشتہ جیسی طویل و مسلسل لکھ ڈالے ۔ ایشیائی شاعری میں غزل گوئی کی صنف
سب سے زیادہ مشکل سب سے زیادہ آسان سب سے زیادہ بکار آمد سب سے زیادہ فضول
بھی ہے ۔ اب یہ شاعر کی استعداد پر موقوف ہے کہ غزل کو ذلیل کر دے یا
معراج پر پہونچا دے ۔ غالب نے غزل کو ذلیل بھی کیا اور اس کے معیار کو
بلند بھی کر دیا ہے مگر صوفی اور وطن پرست کا خلعت پہنانا تو نہایت مضحکہ
انگیز پروپگنڈا ہے ۔ جاہلانہ عقیدت ہے ۔ غالب میں تو اوسط درجہ کی خودداری
وضعداری اور میرزائیت بھی نہ تھی جو اُس زمانے کے شرفاء کا عام چلن تھا ۔

غالب اور وطن پرستی؟ ارے میاں کہاں کی وطن پرستی؟ وطن پرستی کا عملی ثبوت تو لکھنؤ کے شہدوں نے دیا کہ واجد علی شاہ بہادر کے معزول ہونے کے بعد میرزا برجیس قدر بہادر کو زبردستی تخت پر بٹھا کر انگریزوں سے لڑتے رہے اور چھ مہینے تک میرزا برجیس قدر بہادر بادشاہ بنے رہے بعد ازاں جو ہونا تھا سو ہوا۔ اور یہاں تو یہ حال ہے کہ دلی کا راج لٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون سدھارے کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی "مرزا وطن پرست" کو اپنے حلوے مانڈے کی پڑی تھی خلعت و پنشن جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کی ہوس دامنگیر تھی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہونے کی ہوس دل میں رہ گئی۔ خود فرماتے ہیں کہ میرے پاس زر ہوتا تو میں باوجود اس پیرانہ سالی و ضعف و نقاہت کے لاہور جاتا لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہوتا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں داغ حسرت لئے جاتا ہوں۔ سلطنت مغلیہ کا نمک خوار اور اسکے یہ کردار؟ لاحول۔ غور تو کیجئے کیا صوفی ایسے ہی ہوتے ہیں؟ وطن پرستوں کی یہ شان ہے؟ اک آزاد حقیقی شاعر کے خیالات اور ارادے اتنے پست ہو سکتے ہیں؟ اک خواجہ آتش تھے کہ بادشاہ نے خلعت و نقد ان کے گھر بھیجا شہزادہ کی تقریب شادی میں شرکت کی دعوت بھیجی مگر خواجہ صاحب نے سب الٹا واپس کر دیا کہ میری طرف سے بہت بہت تسلیم عرض کرنا اور یہ کہنا کہ اگر میں شریک ہوتا تو کچھ نوید ضرور دیتا۔ بس میری طرف سے یہی نوید تصور کی جائے مگر میں حضوری سے مجبور ہوں۔ سبحان اللہ! کجا یہ شان مردانگی!

کجا وہ ہوس دربارداری۔ آدمی آدمی انتر۔ کوئی ہیرا کوئی کنکر!

عجیب دل لگی ہے۔ غالبؔ کی شان میں چند مزاحیہ رباعیوں نے یاروں کا مزاج کچھ ایسا بحال کر دیا ہے کہ سڑی سودائیوں کی طرح بنکارتے پھرتے ہیں اور میں دور سے بیٹھا تماشے دیکھا کرتا ہوں۔ ایک دِلّی وال صاحب تاؤ میں آکر مجھے لکھتے ہیں کہ اب بھی غالبؔ کے ساتھ نیش زنی سے باز نہ آئیے تو آپ کی شاعری کا قلع قمع کر دیا جائے گا۔ مگر یہ دھونس بہت پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے۔ بیس برس سے سنتا آرہا ہوں۔ اس کان سنتا ہوں اور اُس کان اڑا دیتا ہوں۔ اگر میری شاعری کا "قلع قمع" کر دینا آسان ہوتا تو یارانِ لکھنؤ دبک کر بیٹھ نہ رہتے۔ دِلّی وال صاحب سے کوئی پوچھے کہ میرزا غالبؔ پر سنجیدہ یا مزاحیہ نکتہ چینی کا حق میں نہیں رکھتا تو اور کون رکھتا ہے؟ اور یہ تو فرمائیے آپ غالبؔ کی مدح سرائی کا کیا حق رکھتے ہیں؟ کیا سچ مچ آپ میرزا غالبؔ کے کمالات کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں؟ غالبؔ کے ساتھ نسبتِ قریب آپ کو حاصل ہے یا اُس شخص کو جو غالبؔ کا چچا بھی ہے اور بھتیجا بھی۔ جسے دنیا اپنی کوتاہ نظری سے غالبؔ کا دشمن سمجھ رہی ہے اور یہ امر ممکن ہی نہیں کیونکہ شاعر شاعر کا دشمن تو ہو سکتا ہے (بشرطیکہ دونوں ہمعصر ہوں) مگر شاعر کے کمال کا دشمن ہونا ناممکن بات ہے۔ میں گذشتہ بیس سال سے دنیا کی نگاہ میں اپنے تئیں بظاہر غالبؔ کا دشمن ثابت کرتا رہا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی یہی دل لگی کرتا رہوں گا مگر بقول بسملؔ سندیلوی ؎

یہ ازلی باتیں ہیں کوئی اسے کیا سمجھے — بُت سامنے رکھ لینا اور یاد خدا کرنا

مجھے ساری دنیا سے کیا مطلب؟ مطلب ہے تو بس اتنا کہ بظاہر دُنیا کو احمق بناؤں (مگر دراصل دہ بگڑے ہوئے مذاقوں کی اصلاح کروں) اور دنیا مجھے احمق سمجھے میری حماقتوں پر کھسیانی ہو کر جامے سے باہر ہو ہو جائے۔ مجھے اس میں مزہ آتا ہے۔ غالب کی شان میں میری مزاحیہ رباعیاں اور غالب شکن گل افشانیاں بظاہر ادبی معصیت ہیں مگر وہ دن دُور نہیں جب یہی معصیت اک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گی اور آج بھی یہ صدائے بے ہنگام فضول نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ تعمیری کام کر رہی ہے۔ بقول میرزا یگانہ علیہ السلام ؎

یگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے — دنیا کے ہر مشاہدۂ ناگوار کو

غالب کی "تعمیر میں صورت خرابی مضمر ہے" تو یہاں تخریب میں تعمیر مضمر ہے مگر ان حقیقتوں تک پہونچنا ایسے ویسے غلبچیوں کے نصیبوں میں نہیں۔ شاعر (حقیقی) اک ایسا مصلح ہوتا ہے جس کی خدمات کا اعتراف کرنے میں دُنیا ہمیشہ بُخل و تجاہل سے کام لیتی ہے۔ سچ کہا ہے شیلی نے:-

Poets are the un-acknowledged legislators of the world.

بندہ نواز میری شاعری کا "قلع قمع" کر دینے کی نسبت جو ارشاد ہوا ہے بجا و درست ہے۔ میں جناب کی ہاں میں ہاں ملانے کیلئے حاضر ہوں۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ دلی اور

دلی والوں کے ساتھ عموماً اور میرؔ۔ سوداؔ۔ دردؔ اور حضرت امیر خسروؒ کے ساتھ خصوصاً جو عقیدت خاکسار کو ہے کیا اس عقیدت کا کوئی صلہ بھی عطا فرمایا جائے گا؟ بدی کی سزا کا مستحق ہوں تو کیا نیکی کی جزا میں میری شاعری کو چار چاند لگا دینا بھی آپ کا فرض ہے کہ نہیں۔ آپ کا ایمان کیا کہتا ہے؟ میں گنہگار سہی مگر کیا خدا نے کوئی ایسا بندہ بھی پیدا کیا ہے جس نے گناہوں کے سوا کوئی عمل خیر کیا ہی نہ ہو۔ اگر خاکسار سے کوئی عمل خیر ہوا ہے تو کیا غالب کے ساتھ "ادبی معصیت" کی وجہ سے میزان عمل کے کسی پلّہ میں اُسے جگہ نہ ملے گی؟ ذرا اپنے ضمیر سے مشورہ تو کیجئے کہ یگانہ نے اردو شاعری کے معیار کو بلند کر دیا ہے یا پست؟ اگر اردو کی کوئی خدمت مشکور کی ہے تو کیا اُسکی جزا غالب کی پرستش بیجا کے ساتھ مشروط ہے؟ کیا غالب ہی صدقے میں عمل خیر کی جزا ملے گی۔ اگر ایسا ہے تو مجھے سزا کی پروا ہے نہ جزا کی دنیا تو کیا ہے میں خدا کے سامنے بھی کہہ دوں گا کہ میر تقی میرؔ کی پاک و پاکیزہ شاعری۔ اُن کی خودداری انکی شریفانہ زندگی کا جتنا احترام کرتا ہوں ہرگز غالب کا اتنا احترام نہیں کر سکتا۔ میرؔ کے آگے سر تسلیم خم ہے مگر میرزا غالب کے ساتھ وہی حجاب بھتیجے کی نوک جھونک چلے جائیگی۔ یہ دونوں مقطعے یاد رکھئے

مَرد وا ایک لکھنؤ میں بھی ہے   وہی مرزا یگانہ غالب جنگ

میرؔ کے آگے زور کچھ نہ چلا   تھے بڑے میرزا یگانہ دبنگ

یاد رکھئے بڑے لوگوں کی بڑی بات۔ غالب کے ساتھ میرزا یگانہ علیہ السلام کا تمسخر بھی عوام شکستہ لگام کی کورانہ رفتار عقیدت سے بہت بالا ہے۔ سبق آموز ہی قابل قدر ہے۔ افادی حیثیت سے بھی اور شاعرانہ آرٹ کے اعتبار سے بھی۔ اس حقیقت کی تہ کو پہونچنے کیلئے چشم بینا چاہیئے کہ میرزا یگانہ کا تمسخر غالب کے ساتھ فی الحقیقت تمسخر کی راہ سے ہے یا اس میں کوئی ادبی خدمت کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ اوچھے خیالات اور سطحی نظر رکھنے والے اس تمسخر کو شہرت طلبی پر محمول کریں تو کریں مگر میرزا یگانہ تو وہ شخص ہیں کہ حصول شہرت و شوق ہر دلعزیزی تو کجا اپنے اعزاز عرفی کو گزشتہ بیس پچیس سال سے مسلسل نقصان پہونچا رہے ہیں دونوں ہاتھوں سے اپنے اعزاز و وقار کو لٹاتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو بھی دشمن بنالینا اُن کا دلچسپ مشغلہ ہے جس دوست کی دوستی غالب پرستی کے ساتھ مشروط پائی گئی سمجھ لیا کہ یہ دوستی کچے دھاگوں سے بندھی ہوئی ہے۔ ایسا بودا رشتہ کس کام کا اس کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ بقول جناب آرزو لکھنوی سے

اس رشتۂ خام کو ذرا کس کے بھی دیکھ بودا ہے اگر تو ٹوٹ جانا اچھا!

یہاں ایک اور امر قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ ملک میں اور جتنے مشاہیر عصر ہیں اُن میں سے کسی کے خلاف ایسی سخت برہمی نہیں پائی جاتی جیسی میرزا یگانہ کے خلاف پائی جاتی ہے۔ مگر یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے شیوۂ استمالت مصلحت بینی، زمانہ سازی اور دلربایانہ انداز سے پبلک کو رجھا کر اپنی شاعری کو چمکا

لیا ہے۔ برخلاف اس کے میرزا صاحب بجائے تسخیر قلب کے ہمیشہ جذباتِ عامّہ کو کچلتے رہتے ہیں۔ اس پر بھی میرزا صاحب کا اثر و اعتبار گھٹتا تو کیا بڑھتا ہی گیا دونوں فریقوں کے اعتبار دائرہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک صلح سے تسخیرِ قلب کرتا ہے دوسرا تشدد سے اپنا لوہا منواتا ہے۔ اس چنگیزی ذہنیت پر عرفی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہ مُلک ولایتِ ما رُو منہادہ سلطانے　　کہ ما بہ صلح دہیم او بہ جنگ می گیرد

دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دو انجن دو پٹریوں پر برابر دوڑ رہے ہیں۔ اور دونوں کے پیچھے اور ایک ایک انجن لگا ہوا ہے۔ انجن ۱ کے ساتھ جو انجن لگا ہوا ہے وہ اُسے پیچھے گھسیٹ رہا ہے اور انجن ۲ کے ساتھ جو انجن ہے وہ اُسے آگے ڈھکیل رہا ہے (یہ ہے پبلک کی خوشنودی) مگر انجن ۱ مخالفانہ کشاکش سے پیچھے تو کیا ہٹتا آگے ہی بڑھتا جاتا ہے اور انجن نمبر دو کو تو آگے بڑھنا ہی چاہیئے کہ پیچھے سے ڈھکیلنے والا بھی موجود ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا کہ پچھلے دونوں انجن الگ ہو جائیں گے۔ اُس وقت دونوں کی حقیقی طاقتِ رفتار معلوم ہو جائے گی بہر میرزا صاحب سے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ملک کی ادبی بدمذاقی اور پبلک کی گمراہی کو آنکھوں سے دیکھیں اور خاموش رہیں اس خوف سے کہ غالب کے خلاف آواز بلند کی تو ملک دشمن ہو جائے گا۔ میرزا صاحب اتنے بودے ہوتے تو غریب اُردو کا حق کون ادا کرتا؟

ذاتی اعزاز و وقار کو جو شخص اپنے حسنِ نیت و حُسنِ عمل کے ساتھ وابستہ جانتا ہو اُسے اپنے اعزازِ عرفی کی قربانی کرنے میں تامّل کیوں ہوتا؟ میرزا صاحب کو کیا معلوم نہ تھا کہ غالب کے خلاف قلم اُٹھانے کا انجام کیا ہو گا اور پہلے معلوم نہ تھا تو گزشتہ بیس پچیس سال کے تجربے نے تو ضرور بتا دیا ہو گا۔ مگر دُنیا دیکھ رہی ہے کہ میرزا یگانہ آج بھی اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹے نہیں۔ حصول اعزاز و شہرت کے بدلے آج بھی وہ اپنے اعزاز و وقار کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہے ہیں۔ آخر یہ کیوں؟ کیا دماغ خراب ہے؟ جی نہیں۔ دماغ تو اتنا صحیح ہے کہ ذرا سے بیٹھے بیٹھے اک ذرا سی جیبھ بتا دی اور ہزاروں غلیچیوں کو سڑی بنا کر جامے سے باہر کر دیا۔ بات یہ ہے کہ جو شخص اعزاز و وقار کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ جانتا ہو اپنی ذات سے خارج نہ سمجھتا ہو اُسے پبلک کی خوشنودی ناخوشی کی پروا کیوں ہونے لگی؟ وہ تو اپنے فرائض ادا کرتے رہے گا۔ اُسے معلوم ہے کہ سچی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح چار دن کی بہار دکھا کر خاک میں ملجاتی ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ غالب شکنی اور پبلک کی دل آزاری کے بعد بھی حقیقی شاعرانہ اعتبار جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتا جائے۔

ماٹی ڈیر مسعود صاحب کیا کہوں سخت افسوس ہے کہ ملک کی قوتِ فیصلہ و تمیز نیک و بد کو مختل و معطل دیکھ کر مجھے غالب کے کمزور پہلوؤں پر روشنی

ڈالنی پڑی۔ ورنہ مجھ سے اور میرزا غالب مغفور سے مخالفت و مخاصمت کا کوئی موقع ہی نہیں۔ وہ اُنیسویں صدی کے میں بیسویں صدی کا۔ نہ معاصرانہ چشمک نہ خاندانی بیر۔ میں کہتا ہوں اور کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کی بہ نسبت غالب کے کمالاتِ شاعرانہ کی صحیح قدر شناسی کا جوہر فطرت نے مجھ میں زیادہ ودیعت کیا ہے۔ شاعر کو بحیثیتِ شاعر، شاعری خوب سمجھ سکتا ہے۔ مگر بضرورتِ خاص یعنی ملک کی بڑھتی ہوئی بد مذاقی کی روک تھام کے لئے غالب کے متعلق اس قدر تلخ حقیقتوں کا انکشاف واجب سمجھتا ہوں کہ غالب پرست ذرا حقیقت تلخ کا بھی مزہ چکھ لیں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ گئے گذرے ہو چکے ان کی خلقی کمزوریوں کو بکھانا سخت کم ظرفی و خباثت کی دلیل ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ اس عیب کو عیب نہیں سمجھتا کیونکہ مخاصمانہ جذبہ کارفرما نہیں ہے بلکہ میں اپنا ادبی و قومی فرض سمجھتا ہوں کہ غالب کی تصویر کا دوسرا رُخ دکھا دوں۔ مانا کہ غالب کی شخصیت نہایت محترم ہے مگر غالب سے بھی زیادہ محترم کوئی شے ہے اور وہ ملک کا ادبی مذاق ہے۔ محض غالب پرستی کی خاطر ملکی مذاق کی تباہی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مورخین بڑے بڑے لوگوں کے اعمال نیک و بد دونوں پر روشنی ڈالتے چلے آئے ہیں۔ تاریخیں تذکرے۔ سوانح عمریاں بھری پڑی ہیں اسلاف کے اخلاق و عادات اور اُن کی زندگی کے کارنامہائے نیک و بد سے

اگر تصویر کے دونوں رُخ دکھائے نہ جاتے تو اگلے لوگوں کی کمزوریوں
اور خامیوں سے سبق حاصل کر کے دنیا اصلاح و ترقی کی طرف کیونکر قدم بڑھا سکتی ہے؟
میرے استاد اعظم صلعم نے فلسفۂ عمل کو دو لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔
"الاعمال بالنیات" اس سے بڑھ کر سچا فلسفۂ عمل اور کیا ہوگا۔ میری نیت بخیر ہے
تو اس ادبی معصیت پر کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ تلخ
نوائیاں کسی مخاصمانہ جذبے پر مبنی ہیں۔ یا ان میں کوئی اصلاحی اسپرٹ پوشیدہ
ہے۔ کیا آپ کا ضمیر گواہی دے سکے گا کہ میرا دل صنادید پرستی کے جذبہ سے
خالی ہے۔ کیا میں میر تقی میر۔ میرزا سودا۔ خواجہ میر درد دہلوی میر انیس۔ خواجہ
آتش۔ استاد بحر لکھنوی۔ مولانا اکبر الہ آبادی۔ مولانا شاد عظیم آبادی جیسی بزرگوں
کا احترام نہیں کرتا۔ کرتا ہوں، صدق دل سے احترام کرتا ہوں۔ اسی طرح
غالب کے کمالات کا بھی معترف ہوں مگر اُسی حد تک جتنی میرا ضمیر اجازت دیتا ہو۔
میں غالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ پرائی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا۔
ہر شخص اپنے علم و یقین تک مکلف ہے اور بس۔ "الاعمال بالنیات"
تمام اعمال و افعال کا دارومدار نیت پر ہے۔ نیت ہی پر سزا و جزا کا انحصار ہے
اس فلسفہ کے تحت اک عجیب و غریب واقعہ یاد آگیا جو حد درجہ دلچسپ ہے۔
خطۂ عظیم آباد میں ایک مشہور و معروف طبیب تھے۔ حکیم کاظم حسین صاحب
رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ عموماً الٹا علاج کیا کرتے تھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے مریض کو

مار ڈالینگے مگر اُن کی کامیابی پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ وہاں ایک وکیل تھے غلام قادر نام۔ اُن کا ایک بھائی تھا۔ جو کسی شادی کی تقریب میں چھ سات دن تک شب و روز جاگتا رہا تھا۔ تقریب سے فراغت پانے کے بعد وہ ایک ٹھنڈے اور مرطوب تہ خانہ میں جاکر سو رہا۔ سویا تو دو دن تک شب و روز سوتا ہی رہا۔ گھر میں ڈھونڈھیا پڑی کہ لڑکا کہاں غائب ہو گیا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پتا لگا تو لوگوں نے اُسے جگایا۔ وہ اُٹھا آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ اور اپنے سر پہ ہاتھ رکھا تھا تو ایسا پلپلا معلوم ہوا جیسے گندھا ہوا آٹا۔ جس جگہ سر پہ انگلی رکھتا ہے اس طرح دھنس جاتی ہے جیسے گندھے ہوئے آٹے میں۔ یہ حال دیکھکر لوگوں کے ہوش جاتے رہے۔ بھائی صاحب نے کہا جاؤ جلدی چچا پاس۔ (وہی حکیم صاحب) بچارہ دوڑتا ہوا حکیم صاحب پاس پہونچا۔ اور اپنا سارا حال کہہ سنایا۔ حکیم صاحب نے سر ٹٹول کر دیکھا اور کہا اچھا بیٹھو۔ ذرا پان تو بناؤ۔ وہ پان بنانے لگا اور حکیم صاحب ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچتے جاتے ہیں۔ سوچتے سوچتے ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سِل کا بٹّا پڑا تھا۔ اٹھا کر اور لڑکے کی نظر بچا کر زور سے سر پہ کھینچ مارا۔ وہ بیچارہ بلبلا گیا۔ حکیم صاحب تو دلوانے مشہور ہی تھے وہ یہ سمجھا کہ چچا پہ جنون سوار ہے۔ ڈر کے مارے بھاگا۔ بھاگتا بھاگتا گھر پہونچا۔ اور جو حادثہ عجیب پیش آیا تھا بھائی سے بیان کیا۔ انھیں سخت تعجب ہوا۔ پوچھا کہ بہت چوٹ تو نہیں آئی۔ اب اُسے اپنا سر یاد آیا۔ بھاگتے وقت تو اسے سر پاؤں کا

کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب جو سر کو ٹٹولتا ہے تو اچھا خاصا ہے، سارا پلپلا پن جاتا رہا۔ بھائی صاحب نے ٹٹول کر دیکھا تو انھیں بھی حیرت ہوئی کہ ایسا انوکھا علاج کبھی دیکھا نہ سُنا۔ تھوڑی دیر بعد حکیم صاحب خود مریض کے گھر جا پہونچے کہ دیکھیں کیا حال ہے۔ دیکھا تو سر ٹھیک تھا۔ علاج کی کامیابی پر مُسکرائے۔ وکیل صاحب نے پوچھا چچا جان یہ کیسا علاج تھا کہ بٹا کھینچ مارا اور مرض غائب؟ فرمایا اس لڑکے کے سر میں رطوبت اس غضب کی جمع ہو گئی تھی کہ سر پلپلا ہو گیا۔ اس رطوبت کو جلد سے جلد خارج ہونا چاہیئے تھا۔ مگر دنیا میں کوئی ایسی دوا نہیں کہ اتنی کثیر مقدار رطوبت کو جلد خارج کر سکتی۔ جب تک دوا اثر کرتی اُس سے پہلے مریض کا سر سڑ گل کے پانی ہو جاتا۔ میں نے تھوڑی دیر جو غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر اچانک اسکے سر کو چوٹ پہنچائی جائے تو بہت ممکن ہے کہ مریض کے نظام جسمانی میں ایکا ایکی ہیجان و انتشار پیدا ہو اور وہ رطوبت جو ایک ہی مقام پر جمع ہے تمام جسم میں منتشر ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اچانک چوٹ لگتے ہی رطوبت سارے جسم میں منتشر ہو گئی اور سر کا پلپلا پن جاتا رہا۔ اب اس رطوبت کو جو سارے جسم میں پھیل گئی ہے جُلّاب سے خارج کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جو اصل علاج تھا وہ ہو گیا۔ دیکھیے کتنا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ علم طب کے اعتبار جو نتیجے اس واقعے سے نکلتے ہیں اُن سے ہمیں مطلب نہیں۔ حکیم صاحب کی جودتِ ذہنی کا جو ثبوت ملتا ہے اُس سے سروکار نہیں۔ یہاں فقط یہ دیکھنا ہے کہ حکیم صاحب نے کس نیت سے بٹا کھینچ مارا۔ علاج کی غرض سے۔ نیت انکی بخیر تھی۔ انجام بھی بخیر ہوا۔ اور اگر نتیجہ عمل حسب دلخواہ نہ بھی ہوتا تو بھی اُن سے کوئی مواخذہ نہ تھا کیونکہ ارادہ نیک تھا۔ مجھے بھی اپنے اوپر بھروسا ہے کیونکہ میری

نصیب ہے۔ غالب پر جو کچھ بوچھاریں ہو رہی ہیں انھیں غالب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بوچھار تو فقط اس غرض سے ہیں کہ غالب کی چبھتی ہوئی ذہنیتوں پر چوٹ پڑے دماغوں میں جو مادہ فاسد جمع ہو گیا ہے خارج ہو جائے اور انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔

غالباً اب آپ کو اس امر میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا کہ میری ان تمام تقریروں کا مخاطب غالب نہیں ہو سکتے کیونکہ گفتگو مُردوں سے نہیں ہوتی زندوں سے ہوتی ہے اسکے علاوہ اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کہ میرزا غالب نے خود اپنے پیشرو (مولف برہان قاطع) پر نہایت سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے جو پایہ تہذیب سے گری ہوئی ہے مجھ سے زیادہ غالب پر سخت کلامی یا بد اخلاقی کا الزام کون رکھ سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ غالب پرستوں نے تمام اساتذۂ ماضی و حال کا حق تلف کر کے غالب کو دیدیا ہے مگر میں نے ہرگز غالب کا حق تلف نہیں کیا (اُن کو اردو کا مایۂ ناز شاعر مانتا ہوں) ہاں کھری کھری سنا دی جس کے مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست۔ غالب شکن کی اشاعت کا ذمہ دار کون ہے؟ دِلّی والے ... ترانہ کی محض چند مزاحیہ باعیوں سے چراغ پا ہو کر جب دِلّی والوں نے رسالہ ساقی دہلی کے اکیس ۲۱ صفحوں پر مہمل خامہ فرسائی کر کے ترانہ کو گویا مجموعۂ خرافات باور کرانا چاہا تو میں نے کہا جاتا کہاں ہے، اور لیتا جا۔ یہی غالب شکن کی شانِ نزول۔

غالب شکن کی اشاعت اولین میں میں نے غالب کی شاعرانہ چوریوں کا ثبوت اسلئے پیش نہیں کیا تھا کہ بار ہا ادبی رسالوں میں ثبوت پیش کئے جا چکے تھے۔ مگر اب پھر مطالبہ کیا جاتا ہے تو یہ فرض بھی ادا کئے دیتا ہوں۔ لگی کیوں باقی رکھوں۔

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا؟

(یگانہ)

چوریاں نقالیاں

چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ متاخرین ہمیشہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں مگر چونکہ میرزا غالب کی شاعری کو ڈنکے کی چوٹ سراپا الہامی اور original کہا جاتا ہے معمولی سے معمولی گریجویٹ بھی جو فن شعر میں کوئی مہارت نہیں رکھتا شارح حسرتی کے ساتھ غالب کو آسمانی دیوتا ٹھہراتا ہے اور یہ جتاتا ہے کہ جیسے اس سے بڑھکر غالب کا سمجھنے والا ہی نہیں گویا دنیا میں سب جاہل اور گنوار بستے ہیں۔ تو ظاہر ہے ایسی اشتعال انگیز بکواس کب تک خاموشی کے ساتھ سہی جا سکے گی۔ بہوا خواہان غالب مہمل سے مہمل شعر کو بھی گنجینۂ معانی اور چرائے ہوئے اشعار کو بھی غالب ہی کی بلندیٔ فکر کا نتیجہ ٹھہرا کر جھوٹی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ جھوٹ بولتے انھیں شرم نہیں آتی تو ہم سچ بولنے سے کیوں شرمائیں؟ لو اب آنکھیں کھول کر دیکھو ؎

غالب

پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتب غم کہنا کافی تھا۔ لفظ "دل" فضول بھرتی کے لئے وزن پورا کرنے کیلئے لایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ مکتب غم یا مدرسۂ عشق میں ابھی تک طفل مکتب ہوں ابتدائی سبق پڑھ رہا ہوں اسی ابتدائی حقیقت کو عرفی کس بے تکلفی سے بیان کرگیا ہے ؎

عشق می گویم و می گریم زار طفل نادانم و اول سبق است

دونوں شعر کا ماحصل واحد ہے یعنی عاشق مکتب عشق میں ابھی تک ناتجربہ کار ہے۔ غالب نے اپنے نزدیک تو لفظ "رفتہ" بڑھا کر ایک طرح کی جدت پیدا کرنی چاہی مگر دہقانیت کی کھراند آنے لگی یہ شعر اگر مسروقہ نہیں تو original بھی نہیں ہے۔

(غالب)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

مطلع صاف ہے مگر مضمون پامال ہے۔ اردو فارسی میں سیکڑوں اشعار اسی مضمون کے موجود ہیں

ظہوری

شد طبیب ما محبت منتش بر جانِ ما محنت ما۔ راحت ما۔ درد ما۔ درماں ما

(مولانا رومی رح)

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علت ہائے ما

یاروں کی عادت ہے کہ پامال سے پامال مضمون کو بھی تازہ سمجھ لیتے ہیں محض اس وجہ سے کہ غالب نے کہا ہے۔

غالب

بدعلم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بال عنقا جلگیا۔

اس شعر کی تعریف یہ ہو کہ میرزا بیدل کی نقالی کی گئی ہے ؎

ہمچو عنقا بے نیاز عرض ایجادیم ما یعنی آں سوئے عدم یک عالم آبادیم ما

وہی عنقا - وہی عدم سے پرے ہونا جو بیدل نے کہا وہی غالب نے بھی کہہ دیا اسے چوری کہو یا نقالی -

غالب

شمار سُبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا ۔۔۔ تماشائے بہ یک کف بردنِ صد دل پسند آیا

غالب کے تمام مراتب کمال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ شعر نہایت ذلیل ہے کسی نے کیا خوب مصرع پہ مصرع لگایا ہے ؎

بلبل کی انگڑیوں میں رگ گل کی پھانس ہے ۔۔۔ مصرع تو کچھ نہیں ہے فقط ٹھونس ٹھانس ہے

غالب کا یہ شعر بھی ٹھونس ٹھانس کے سوا کچھ نہیں - اردو میں "بیک کف بردن صد دل" خاص دیوزاد کی زبان ہے شعر کو مطلع بنانا تھا تو بت کے اندر ایک انوکھی صفت (مشکل پسندی) ٹھونس دی جسکی دیدہ نہ شنید - کجا بت کجا مشکل پسندی - مارو گھٹنا پھوٹے سر آباد شعر کی ہیئت کذائی چغلی کھا رہی ہے کہ ہو نہو کہیں کی چوری یا نقالی ہے - آخر پتہ چلگیا کہ میرزا صائب کا منھ چڑھایا گیا ہے ؎

زمکر سُبحہ شماراں خدا نگہدارد ۔۔۔ کہ صد سر است بہ یک حلقۂ کمند اینجا

میرزا صائب نے کس خوبی سے ریاکاروں کے ظالمانہ فریب کی تصویر کھینچی ہے کہ ظاہر میں تو یہ لوگ تسبیح صد دانہ کھٹکھٹاتے رہتے ہیں مگر ان کی کمند فریب میں تسبیح کے دانوں کی طرح بیگناہوں کے سو سو سر بندھے ہوتے ہیں - یہ تازہ و لطیف مضمون دیکھکر غالب کے منھ میں پانی بھر آیا - کوئی چوری کرتا ہے تو حرف بہ حرف نہیں کرتا کچھ نہ کچھ الٹ پھیر کر کے اپنے مال کو اپنا بنا لینا چاہتا ہے - جوتے چور مجلسوں کے جوتے چرا لے جاتے ہیں تو

ادن پہ کسی رنگ کی پالش پھیر کر بازار لیجاکر کوڑے کر لیتے ہیں۔ غالب نے (صد رسات
بہ یک حلقہ کمند) کی جگہ (بہ یک کف بردن صد دل) کہکر گویا تازگی پیدا کرنا اور
اپنی چوری چھپانا چاہی۔ مگر اس چالاکی کے بعد بھی جو شعر گانٹھا ہے وہ اتنا بھدا
ایسا عجیب الخلقت ہے کہ توبہ ہی توبہ۔ کسی کو تسبیح پڑھتے دیکھکر "بہ یک کف صد دل"
کا تماشا اُس بت مشکل پسند کو مرغوب آیا۔ (مرغوب آیا بھی فارسیانہ دہقانیت ہی) تو
ایک ایک ہتھے میں سو سو دل اڑا لینے کی فکر میں وہ بت (مشکل پسند) خود بھی سبحہ
شماری پر اُتر آیا۔ بھلا اس دیوانی تخئیل کا کیا ٹھکانا ہے۔ کیا اس خیال میں کوئی
بوئے صداقت کوئی رنگ حقیقت شامل ہے؟ کیا کسی بُت کے ذہن میں کبھی یہ بات
آئی ہوگی کہ سو سو دل ہتھیانے کے شوق میں تسبیح صد دانہ کھٹکھٹانے لگے! اس جھوٹ
اور بے اثر بات کو الہامی کہو [illegible] کہو کچھ بھی کہو مگر یہ شعر ہے نہایت ذلیل
میرزا صائبؒ نے بیباکانہ دلوں کے ظالمانہ فریب کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سراسر حقیقت و
صداقت ہے مگر یہاں سراپا جھوٹ۔ نری دہقانیت۔ چوری بھی کی تو بھدے پن کی
میں ان حقائق تلخ کو ایسے تلخ لب لہجہ میں کیوں بیان کر رہا ہوں۔ کیا واقعی غالب
کی شان میں گستاخی مقصود ہے؟ نہیں میں ایسا سڑی نہیں ہوں کہ مُردوں پر طعن کروں
وہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں۔ میری آواز اُن کے کانوں تک پہنچ سکتی ہی نہیں
تو یہ طعنہ زنی کوئی مردانگی نہیں محض دیوانگی ہوگی!۔ ہاں غالب کے دستے جو
غالب کو ایک آسمانی دیوتا بنا کر پیش کیا کرتے ہیں اُن کی بہکی ہوئی ذہنیتوں کو قلم کے

زور سے کچل ڈالنا ایک ادبی فرض ہے۔

غالب

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا　　یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

مطلع نہایت پاکیزہ و روشن معانی و مطالب کے لحاظ سے بہت بلند۔ انداز بیان کے اعتبار سے بھی بے عیب ہے مگر اسے original کہنا نادانی ہوگی۔ پرانا فلسفہ ہے جسے غالب نے نہایت صفائی سے اردو میں بیان کر دیا ہے۔ مگر یہ پایا کہاں سے؟ مجھ سے سنیئے۔ میرزا صائب فرماتے ہیں ؎

در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو　　عالم پر است از تو و خالی است جائے تو

اس حقیقت کبریٰ کو شعرا نے بیسیوں طرح سے بیان کیا ہے مگر میرزا صائب کے مطلع کو شاید ہی کوئی پہونچ سکا ہو۔ یہ وہ مطلع نور ہے کہ میرزا صائب کی وصیت کے مطابق ان کے مزار پر کندہ کرا دیا گیا ہے۔ میرزا بیدل نے بھی اسی مضمون کو اپنے انداز سے کہا ہے اور عرفی نے بھی ذرا الگ ہو کر داد فکر دی ہے۔ بیدل ؎

ز ساز الفت آہنگ عدم در پردہ گوشم　　نوائے می رسد کز بیخودی نتوان شنیدن ہا

عرفی

مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموش اند　　کہ نغمہ ناز کی و حجاب پنبہ در گوش اند

سب نے اپنے اپنے طرز سے بیان کیا مگر صائب کا مطلع الہامی شان رکھتا ہے۔

غالب

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ شعر بتدیوں کا سا ہے مضمون بھی نیا نہیں۔ دیکھئے خواجہ حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے سے

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہرِ ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ ! ؎

غالب

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا　　زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

بھی نقل اتاری ہے۔ غالب اس شعر کے مصنف نہیں ہیں مترجم ہیں۔ کسی نے اس سے پہلے کہہ گیا ہے سے

لذت نہ دور و بسکہ دل زار من گرفت　　ناخن ندم بہ داغ اگر بستدن گرفت

صاف ظاہر ہے کہ غالب نے اسی کی نقل اتاری ہے مگر کامیابی کے ساتھ۔ "ناخن بڑھ آنے"

کا اشارہ نہایت بلیغ ہے۔

غالب

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اس مشہور و معروف شعر کو پہلے میں غالب ہی کا کارنامہ سمجھتا تھا مگر آخر پتا چلا کہ اس کے مصنف

کلا بیامی ہیں۔ غالب ہیں سے لے اڑے ہیں۔ بیامی سے۔

بیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من　　از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم

کہتا ہے کہ تو مجھ سے وعدہ کر لے اور اس امر کا اندیشہ نہ کر کہ وفا بھی کرنا پڑے گا کیونکہ

وعدہ کی خوشی مجھے آج سے کل تک پہنچنے ہی نہ دیگی۔ آج ہی خوشی کے مارے مر جاؤنگا

اس شعر کو دیکھکر غالب کی چوری یا نقالی کی حقیقت کھلتی ہے۔ غالب پرست ہزار کوشش کریں

ایسی چوری کی لیپا پوتی نہیں ہوسکتی۔ غالب کا شعر "بفردا نمی رسم" کی شان بلاغت کو نہیں

نہیں پہونچ سکتا۔ اسکے علاوہ پیامی کے شعر میں "بیم از وفا مدار" کے فقرہ سے جو معنوی خوبیوں میں اضافہ ہو گیا ہے وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے آمادہ کیا ہے اس مفہوم کا غالب کے شعر میں پتا تک نہیں۔

غالب

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے ‌‌ ‌ غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

عرفی

غم نعمت است خور دنی آں از خوان عشق ‌ ‌ ‌ اے اہل روزگار غم روزگار چیست

عرفی ہی شعر سے رنگ اڑا کر کچھ کہنا پایا مگر اُسکی بلندی کو نہ پہونچ سکے۔ عرفی کہتا ہے کہ غم بھی ایک نعمت ہے کھانے کے قابل مگر اسکا مزہ جب ہے کہ خوان عشق سے حاصل کیا جائے غم عشق کے سامنے غم روزگار کیا مال ہے غم کھانا چاہتے ہو تو عشق کا غم کھاؤ غالب کی افتاد طبع کی طرف ہی وہ غم کو ناگوار و جاں گسل پا کر چھٹکارا چاہتے ہیں مگر عرفی اسی نعمت سمجھتا ہے

غالب

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں ہم ‌ ‌ ‌ اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی

وقت خوش خوش کہ نکشودند چوں در بر رخش ‌ ‌ ‌ بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نزد

عرفی کہتا ہے کہ جب در مقصود مجھپر نہ کھلا تو میں نے اُسی بند دروازے کے پاس دھنی

دیدی دوسرا دروازہ نہ کھٹکھٹایا۔ عرفی کے شعر سے "اِک نکھا پن" پایا جاتا ہے (امید کے ساتھ) کہ ایک ہی دروازہ پہ اڑ کے بیٹھ گئے۔ غالب کے شعر سے شانِ خود داری کے ساتھ ترکِ مطلب کا پتا ملتا ہے کہ درِ مقصود بند پایا تو اُلٹے پھر آئے ڈہئی نہ دی مگر ترکِ مطلب ہی مقصد تھا تو اپنی جگہ سے ہلے کیوں کعبہ تک گئے کیوں؟ غالب نے مضمون تو عرفی ہی سے اُڑایا ہے مگر کلام میں روانگی و برجستگی ہے اور شعر کیلئے یہ بڑی ضروری چیز ہے معنی خواہ کیسے ہی پست ہوں یا بلند۔

غالبؔ

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

دھوم تو بہت تھی مگر شہادت سے محروم ہی رہے۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ ایک ہی بات ہے کہ روکھے پھیکے الفاظ میں کہو تو کچھ چبتی نہیں اور اُسی کو شاعرانہ قوت کے ساتھ بیان کرو تو کہیں سے کہاں پہونچ جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو عرفی نے کس دھوم دھام سے بیان کیا ہے کس بلندی پہ پہونچکر دادِ فکر دی ہے ؎

طغیانِ نازبین کہ جگر گوشۂ خلیل آید بزیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند!

اللہ رے وفورِ ناز کہ فدیۂ حق تلوار کے نیچے آکر بھی شہادت سے محروم رہ جاتا ہے۔ بڑے بَلّے کا شعر ہے۔

غالبؔ

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدلؔ

دل آسودۂ ما شورِ امکاں در نفس دارد گہر دُزدیدہ است این جا عنانِ ضبط دریا را

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ بیدل کے شعر کی کھلی ہوئی چوری ہے افسوس۔

غالب

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اسکو اسؔد جفا میں اُس کی ہے انداز کار فرما کا

یہاں غالبنے شیخ مصحفی کے اک شاگرد کے مشہور و معروف شعر کی نقل کی ہے۔

شاگرد مصحفی

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

غالب

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

یہ کوئی شعر نہیں ہے کلام موزوں ہے۔ اگلے لوگ بھی کہہ گئے ہیں۔ حزیں ؎

چہ شد ار توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی پیش ابر کرم پیر مغاں این ہمہ نیست

لالہ خاتون

من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی تو خود (این) توبہ نکردی کہ مرا مے نہ دہی

لالہ خاتون کی نقل اتارنے کو اتاری مگر کوئی خوبی پیدا نہ ہوئی۔

غالب

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

نہایت ناقص شعر ہے کاٹ کے پھینکدینے قابل۔ دیکھو کیا مزے کی بات

ہے کہ عاشق اپنی بدگمانی و رشک کے مارے معشوق کو سرگرم خرام یعنی چلتے پھرتے

بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ چاہتا ہے کہ شعر میں بندھا ہے۔ کیونکہ چلتے چلتے معشوق کے چہرے پر پسینے کے جو قطرے آجاتے ہیں عاشق اسے پسینہ نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے (اُلو کا پٹھا) کہ رقیب کی چشم حیراں چہرۂ معشوق پر پڑ رہی ہے۔ بھلا عاشق کس دل سے گوارا کریگا کہ غیر کی آنکھ پڑے۔ اب مذاقِ سلیم ہی اس کا فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا اس شعر میں کچھ بوئے صداقت کوئی شاعرانہ لطافت پائی جاتی ہے یا محض اوٹ پٹانگ تخئیل ہے۔ حسینوں کے چہرے کا مشاہدہ سبھی کرتے ہیں مگر پسینے کے قطروں پر چشم رقیب کا گمان ہونا کتنی بے تکی بات ہے۔ خیر آگے چلئے اور History of thought کے ماہرین سے پوچھئے تو وہ یہی کہیں گے کہ غالبؔ نے میرزا بیدل کے شعری مضمون اُڑا کر کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہی بات ہوئی کہ کوا چلا ہنس کی چال۔ اجی حضرت جو بات اپنی تہِ دل سے نکلتی ہے اُس کا انداز ہی کچھ اور ہوتا ہے دوسروں کی دیکھا دیکھی جو نقل اتاری جاتی ہے وہ کچھ اوپری اوپری سی معلوم ہوتی ہے۔ کبھی تو نقل بن پڑتی ہے کبھی بگڑ جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں اپنا جذبۂ دل شریک نہیں ہوتا۔ بیدل ؎

حیا را ہم نقابِ معنیِ نازش نمی خواہم کہ می ترسم عرق بر بہ بندد چشم غمازے ،

دیکھئے بیدل نے کیا کہا اور کیونکر کہہ گئے۔ ترجمہ "میں حیا کو بھی نہیں چاہتا کہ اُس کے ناز و انداز کیلئے حجاب بن جائے مبادا اُسکے چہرے کا عرقِ شرم اُسکی چشم غمازہ کو بند کر دے یعنی شرم کے مارے اُسکی غمازہ آنکھیں بند ہو جائیں"۔ حیا اک پاکیزہ و لطیف خاصہ ہے حُسن کا۔ مگر نگاہ عاشق ہر گھڑی حُسن کو شرم و حیا ہی میں ڈوبا ہوا

دیکھنا نہیں چاہتی۔ ناز و انداز کا تماشا بھی دیکھنا چاہتی ہے شاعر کہتا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ حیا حسن کے انداز و ناز کا حجاب بن جائے۔ شرم و حیا سے حسن کو پسینا آجائے اور اس کی وہ غماز آنکھیں جو دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہیں شرم کے مارے بند ہو جائیں کیونکہ پھر وہ اندازہ کر سکتے جو کیفیت باطنی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ آنکھوں سے ظاہر نہ ہو سکیں گے۔ چونکہ حیا مزاج حسن کی کیفیت باطنی پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لئے عاشق کو حیا کی یہ پردہ داری ہر گھڑی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ میرزا بیدل نے حسن کا وہ مرقع پیش کیا ہے جو بالکل نیچرل ہے۔ اک حسین چہرے پر عرق شرم و حیا کا مشاہدہ کیسے جو نہایت لطیف مشاہدہ ہے، حسن کی قلبی گہرائیوں کی تھاہ نہ ملنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مگر بیدل کی دیکھا دیکھی غالب نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں حقیقت و صداقت کی کوئی تک نہیں۔ بالکل natural ہے کیونکہ پسینے کے قطروں پر چشم رقیب کا گمان ہونا بے تکی بات ہے۔ بیدل کے شعر میں معنوی لطافتیں دیکھ کر غالب کے منہ میں پانی بھر آیا مضمون اڑا کر کچھ کہنا چاہا مگر بات بنتی تو کیا الٹی بگڑ گئی۔ غالب کے شعر میں "رخ پہ ہر قطرہ عرق" شرم و حیا کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ سرگرم خرام ہونے کا نتیجہ ہے۔ اب اہل ذوق خود فیصلہ کرلیں کون سا قطرہ عرق زیادہ لطیف ہے؟ وہ جو شرم و حیا کا نتیجہ ہے یا وہ جو چلتے چلتے تھک جانے کا نتیجہ ہے۔ کسی کا مضمون اڑاتے وقت کوئی حرف بہ حرف ترجمہ نہیں کر دیتا۔ اصل ماخذ سے کچھ نہ کچھ الگ کرنا ضرور چاہتا ہے۔ غالب نے بھی یہی کوشش کی مگر ناکام و نامشکور۔ دونوں شعر معنوی

اعتبار سے جیسے کچھ ہیں اُن کا فرق دکھا دیا گیا۔ بیدل نے اپنا مفہوم کامیابی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ نہ کوئی الجھن ہے نہ خامی غالب کا شعر معنوی حیثیت سے تو مہمل ہے اور بیان کے اعتبار سے بھی بہت سے جھول پڑ گئے ہیں۔ شعر کی نثر کر دیکھئے تو جھول صاف نظر آنے لگے گا:۔

بدگمانی نے کس کی بدگمانی نے ؟ (میری) بدگمانی نے اسے سرگرم خرام نہ چاہا (میں) اُسکے رُخ پہ ہر قطرۂ عرق (کو) (رقیب) (کا) دیدۂ حیراں سمجھا" اتنی سی مختصر عبارت میں ایک نہیں دو نہیں پانچ پانچ لفظ (میری۔ میں۔ کو۔ رقیب۔ کا) متروک و محذوف ہیں۔ کیا یہ کلام کا شرمناک نقص نہیں ہے؟ اک اور عیب فکِ اضافت کا ہے کہ ہر قطرۂ عرق کی جگہ (ہر قطرہ عرق) بلا اضافت کہدیا۔ جو اُردو میں نہایت بھدّا معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو چوری اس پہ یہ بدڈھنگا پن!

غالب

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

یہ شعر جتنا مشہور ہے اتنا ہی مہمل ہے۔ مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ کہتا ہے۔ کوئی ایک مرکزِ خیال قائم ہی نہیں ہوتا ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ میاں سُہا یوں شرح کرتے ہیں کہ پتھر اُٹھاتے ہی یہ خیال گذرا کہ آئندہ کہیں میرے سر کی بھی حالت نہ ہو۔ مگر "سر یاد آیا" کی یہ توجیہہ سے سر و پا ہے مہمل ہے کیونکہ لڑکپن میں اتنی دور اندیشی (کہ اُس شخص کے سر کا بھی یہی حال نہ ہو) غیر ممکن سی

بات ہے۔ میاں حزیں فرماتے ہیں۔

ہگدیا ڈر کے سوچ کر انجام
زیر پا جب کوئی مزار آیا

بات ٹھکانے کی ہے۔ مگر یہی بات اگر کسی لڑکے کی طرف منسوب کردی گئی ہوتی تو بے معنی تھی! کیونکہ لڑکپن میں اتنی دور اندیشی کہاں؟ مولانا نظم طباطبائی "سر یاد آیا" کی شرح اس طرح فرماتے ہیں "یعنی پتھر اپنے ہی سر میں مار لیا" سہا کہتے ہیں مجنوں کے پتھر مارتے مارتے چھوڑ دیا۔ اور مولانا نظم کہتے ہیں خود اپنے ہی مار لیا۔ غرض جتنے منھ اتنی باتیں۔ مولانا نظم "سر یاد آیا" کے بعد اتنا جملہ (اپنے ہی سر میں مار لیا) محذوف مان کر معنی کی چول بٹھانا چاہتے ہیں مگر پھر بھی نہیں بیٹھتی۔ آخر کیوں اپنے سر میں مار لیا کیا خیال آگیا۔ کوئی وجہ نہیں معلوم تو اپنے سر میں پتھر مار لینا کیا معنی۔ ایک بات ہوتی ہے دو نگھی کہ جدھر لیجاؤ۔ معنی پیدا ہوتے ہیں اور ایک بات ہوتی ہے ادھڑی دھڑی کہ کسی طرف لگتی ہی نہیں۔ سر کیوں یاد آیا۔ اس کا سبب کھلتا ہی نہیں۔ المعنی فی بطن الشاعر! یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس انداز کے برجستہ (مگر فی الحقیقت بے ربط و مہمل) اشعار مشاعرے میں کڑک کے پڑھ دیئے جائیں تو قیامت برپا ہو جائے۔ دوسرا مصرع اتنا برجستہ ہے اور پتھر اٹھانے کے بعد اچانک "سر یاد آیا" کا فقرہ اس غضب کا ہے کہ ذہنِ سامعین کو معنوی ربط و تعلق کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ یہی اچانک "سر یاد آیا" شعر کو لے اڑا۔ مگر غور کرنے کے بعد ایسی بادِ ہوائی باتوں پر خود ہنسی آتی ہے کہ ہم نے کیا سمجھ کر شعر کی تعریف کی تھی۔ چوری کی عادت آدمی کو بدنام کر دیتی ہے۔ غالب کے بہتیرے اشعار

پر شبہ گزرتا ہے کہ یہ بھی کہیں پرایا مال نہ ہو۔ چنانچہ اس شعر کی نسبت بھی یہ شبہ صحیح ثابت ہوا فارسی کے ایک شعر کی نقل اتارنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

یادِ ایامِ جنوں بر سرِ من بارد سنگ — کودکاں را چو ز مکتب کسے آزاد کند

کہنے والا کس خوبی سے کہہ گیا کہ لڑکے جب مکتب سے چھٹی پاتے ہیں تو انھیں دیکھکر اپنے ایامِ جنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس یاد سے گویا اُس شخص کے سر پر پتھر برسنے لگتے ہیں غالب اپنے دوسرے مصرع کی روانی سے دھوکہ کھا کر یہ سمجھے کہ شعر مکمل ہو گیا۔ حالانکہ مہمل ہو گیا۔

غالب

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

واہ بھئی واہ کیسی شاعری ہے۔ تاخیر ہوئی تو سبب تاخیر بھی ہوگا۔ ہاں ضرور ہوگا کسی نے لگام پکڑ لی ہوگی مگر اس میں کیا شاعرانہ خوبی ہے۔ بات تو سچی ہی۔ مگر ہر سچے اور موزوں کلام پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔

ایک دو تین چار — پانچ چھ سات آٹھ

فاعلن فاعلات — فاعلن فاعلات

اکہتر بہتر تہتر چوہتر — پچھتر چھہتر ستتر اٹھتر

فعولن فعولن فعولن فعولن — فعولن فعولن فعولن فعولن

دیکھئے کیسے بچے تُلے مصرع ہیں۔ معنی کے اعتبار سے کتنے صحیح۔ ایک کے بعد دو تین کے بعد چار سبحان اللہ کتنی سچی شاعری ہے۔ کیونکر کہوں غالب کے مذکورہ بالا

شعر پر شعر کی تعریف صادق آسکے گی۔ بات یہ ہے کہ غالب نے عرفی کے اک شعر کی نقل اتارنی چاہی مگر بن نہ پڑی۔ عرفی ؎

زغیرت تیغ و تاب افتاد در رگہائے جان من ہمانا دست امید کسے آرد عنانش را

کہتا ہے کہ شاید کسی کے دست امید نے معشوق کے سمند ناز کی لگام پکڑ لی ہے اس خیال سے وہ شخص پیچ و تاب کھا رہا ہے جذبۂ رشک کی کیا خوب تصویر ہے۔ اصل و نقل کا فرق ظاہر ہے ؎

غالب

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

حضرت عمر خیام کی نقل اتاری ہے حکیم موصوف چرخ ستمگار کو مخاطب کرتا ہے کہ اگر نااہلوں اور بے خردوں ہی سے تجھے الفت ہے تو میں کچھ ایسا خردمند نہیں ہوں۔ پھر مجھ سے اتنی عداوت کیوں ہے خیام

گر میل تو با بے خرد و نااہل است من نیز چناں اہل و خردمند نیَم

عمر خیام نے جو کچھ کہا تھا دوسرے لفظوں میں غالب نے بھی وہی کہدیا۔ مگر چونکہ یہ مضمون عامۃ الورود ہے اس لئے غالب کے اس شعر پر توارد کا حکم لگانا زیادہ صحیح ہے۔

غالب

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھکر

نشۂ شراب میں معشوق کی مستانہ رفتار دیکھکر موجِ مے خوف سے کانپ رہی ہے کہ اس چال سے خلق خدا کا خون ہو گا۔ اور یہ خون مینا کی گردن پر رہے گا۔ اسطرح کی

خیالی ہوا بندی ناسخ لکھنوی کے لئے زیبا ہے۔ اس زمانے میں ناسخ کی مصنوعی شاعری کا زہر ہندوستان بھر میں اتنا پھیل گیا تھا کہ غالب سا شخص بھی اس کے اثر سے بچ نہ سکا۔ دیوان غالب میں بہیترے اشعار ناسخ کے رنگ کے موجود ہیں۔ یہ شعر دیکھنے میں تو نیا معلوم ہوتا ہے مگر یہ بھی نقل ہے میرزا صائب کے اک شعر کی۔ صائب ؎

سر مینائے مے و ہمت او را نازم کہ گرفتہ است گناہ ہمہ بر گردن خویش

میرزا صائب کہتے ہیں کہ مینا نے سب کا گناہ اپنے سر لیا ہی۔ غالب کہتے ہیں خلقِ خدا کا خون مینا کی گردن پر ثابت ہے۔ اصل و نقل کا فرق ظاہر ہے۔

غالب

اسد بسمل ہی کس انداز کا قاتل سے کہتا ہی تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

بڑا بانکا شعر ہے۔ مگر یہ خیال شیخ علی حزیں کے اک شعر سے پیدا ہوا ہے۔ جسے ترقی دیکر غالب نے نقل کو اصل سے بڑھا دیا۔ حزیں ؎

چہ لذت بود از قاتل حزیں نیم بسمل را کہ در خون می تپید و آفریں می گفت بر دستش

غالب

صفائے حیرتِ آئینہ ہی سامان زنگ آخر تغیر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہی رنگ آخر

بیدل

در طینت فسردہ صفا ہا کدورت است آئینہ می کند ہمہ زنگار آب را

غالب

نہ کی سامانِ عیش جاہ نے تدبیر وحشت کی ہوا جام زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

بیدلؔ

منزلِ عیش تو وحشت کدۂ امکاں نیست
چمن از سایۂ گل پشت پلنگ است این جا

از وحشت این بزم بعشرت نتواں زیست
ہر چند چراغانش گلِ پشت پلنگ است

ان اشعار پر شعر کی تعریف صادق نہیں آتی۔ ابتدا میں جب شعر کہنے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو اسی طرح ادھر ادھر سے مضامین اڑا کر شعر گانٹھا جاتا ہے۔ بیدلؔ کے اشعار میں آب آئینہ اور رنگا رنگ بزم عیش اور پشت پلنگ وغیرہ دیکھکر نقل اتاری گئی ہے۔

غالبؔ

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اردو میں "متاعِ بردہ" کی ترکیب تو ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے کوئی جنگل کا جانور پکڑ لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مال بھی پرایا ہے۔ نظیریؔ سے

نشاطِ رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم
کہ بد معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

نظیریؔ کہتا ہے کہ اگر عیشِ گذشتہ کو ہم پھر حاصل کرنا چاہیں تو اسکی یہی صورت ہے کہ صبر کریں شاید صبر کے بدلے میں عیشِ رفتہ پھر حاصل ہو جائے ورنہ زمانہ تو ایسا بے ایمان بد معاملہ ہے کہ ہزار تقاضے کیجئے ایک نہیں سنتا۔ اسی بات کو غالبؔ نے یوں کہدیا ہے کہ ہم فلک سے عیشِ رفتہ کا اس طرح تقاضا کرتے ہیں جیسے رہزن سے کوئی اپنے مال کا تقاضا کرے۔ نظیریؔ کے شعر کی کھلی ہوئی چوری ہے۔

غالبؔ

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

اس ٹھونس ٹھانس سے شبہ گزرتا ہے کہ یہ بھی کہیں پرا پامال نہ ہو۔ ہاں یہی بات ہے ملا شیدا کہتے ہیں سہ

گفتن دعا بزلف تو تحصیل حاصل است   با خضر کس نگفت کہ عمرش دراز باد

ملا شیدا کے شعر سے مضمون اڑا کر کچھ کہنا چاہا تھا مگر شعر تو گھٹا نہیں گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ میرا فسون نیاز مطلب مشکل کا حریف نہیں بن سکتا۔ اب اس اردو کے جملہ کے معنی پھر بیان کروں کیا معنی کہ نیازمندی کا جادو چلتا نہیں۔ ناک رگڑنے سجدے کرنے سے مطلب مشکل حاصل ہوتا نہیں۔ دعا قبول ہوتی نہیں تو پھر ایسی دعا کیوں نہ مانگیں ایسی شے کیوں نہ طلب کریں جو پہلے ہی سے حاصل ہے اور وہ دعا یہ ہے کہ عمر خضر دراز باد خضر کی عمر تو پہلے ہی سے دراز ہے اب چاہے دعا قبول ہو کہ نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ملا شیدا کے شعر سے مضمون اڑا کر اک گورکھ دھندا بنایا گیا ہے۔

غالب

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم   ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

دوسرا مصرع کتنا پیارا ہے۔ مگر پرتو خورشید کی جگہ "پرتو خور" اردو میں کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ شبنم و خورشید کا مضمون نہایت پامال ہے۔ حزیں سہ

گرانجان تر ز شبنم نیست جان ناتوان من   اگر می بود با من بوئے گرمی آفتابش را

غالب

تماشا کہ اے محو آئینہ داری   تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

معشوق کو جو آئینہ دیکھنے میں محو ہے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کیونکر؟ اردو سکر بیٹھے

سامنے روزمرہ میں نہیں بلکہ فارسیانہ انداز سے فرماتے ہیں تماشا! یعنی تماشا کو کیا معنی کہ ادھر دیکھ۔ بھلا اس قسم کی جدتوں یا بدعتوں کو اردو زبان کیونکر گوارا کر سکتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے تھے (ادھر دیکھ لے محو آئینہ داری) مگر وہاں تو فارسیت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسکے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ اس مقام پر لفظ آئینہ داری قطعاً غلط ہے۔ سیاق عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا خطاب اس شخص سے ہے جو محو خود بینی ہے آئینہ دیکھ رہا ہے۔ مگر وزن برابر کرنے کے لئے خود بینی کی جگہ آئینہ داری کہدیا اور یہ سمجھ لیا کہ خود بینی کا مفہوم ادا ہو گیا حالانکہ مفہوم الٹ گیا۔ اجی حضرت آئینہ دار کہتے ہیں آئینہ دکھانے والے کو آئینہ دیکھنے والے کو نہیں کہتے۔ آئینہ داری اک خدمت ہے جو کنیزوں اور پرستاروں کیلئے ہی حُسن کی شان تو خود بینی ہے نہ کہ آئینہ داری واہ کیا خوب ٹھوکر کھائی ہے غالب تو ہیں ضرورت کے بندے۔ اپنی غرض کے آگے کیا سوجھے۔ لفظ کے مفہوم کو الٹ دیں (اور اس کا نام جدت یا اجتہاد رکھا جائے) معنی کا خون کریں۔ زبان کی مٹی پلید کریں اُن کے لئے سب جائز ہے کیونکہ وہ آسمانی دیوتا ہیں زبان اور فن کے قواعد و ضوابط سے بے نیاز۔ اسکے علاوہ مضمون بھی نیا نہیں ہے۔ حزیں کی نقل اُتاری ہے ؎

جلوہ در خانۂ آئینہ بہ خود بنمائی　　گر بدانی کہ بہ من حسرت دیدار چہ کرد!

غالب

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیا غضب ہے اس چوری کے مال پر بھی جدت کا اہتمام رکھا جاتا ہے کہنے والے پہلی کہہ گئے ہیں سے

زخضر عمر فزوں است عشقبازاں را ، اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را ،

عمرِ من گیرم کہ باشد عمر تا روز حساب ، زیستن بے تو نباشد در حسابِ زندگی

غالبؔ

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب ، لطمۂ موج کم از سیلیٔ اُستاد نہیں

پامال مضمون ہے بہتیروں نے کہا ہے۔ ظہیر فاریابی سے

صد تپہائے عشق را کے بوالہوس دارد قبول ، کے تمنا سد طفل قدرِ سیلی اُستاد را

غالب

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو ، یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

شعر اگرچہ بے لطف original نہیں ہے بلکہ اصل سے بڑھ گیا ہے۔ ملا فیاض قمی سے

ہر کس کہ زخمِ کاریِ ما را نظارہ کرد ، تا حشر دست و بازدِ او را دعا کند

غالب

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں ، خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

خوب شعر ہے مگر original نہیں ہے۔ امیر خسرو کے شعر میں بڑی قابلیت سے تصرف کیا ہے خسرو سے

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چگونہ اند ، آں لالہ روئے ہا کہ درتہ گرد فنا شدند

غالب

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں ، موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پُرانا مضمون ہی جو طرح طرح سے کہا گیا ہے۔ غالب نے خواہ مخواہ بات کو طول دیا۔ میر صاحب نے کس اختصار سے فرمادیا ہے ؎

ہم سے بن مرگ کیا جدا ہو ملال
جان کے ساتھ ہے دلِ ناشاد

غالب

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

پُرانا مضمون ہے۔ نہایت پامال۔ صائب کہتے ہیں ؎

درخلوتِ دل ہست تماشائے ہر دو کون
صائب چگونہ سرزگریباں بدر کند

غالب

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

عرفی کے ہاں سے مضمون اڑالیا ہے ؎

بکیشِ برہمناں آنکس از شہیدان است
کہ در عبادت بُت روئے بر زمین میرد

عنایت صمدی رَدِ کفر مانہ کند
اگر کمال پذیرد صنم پرستیِ ما

غالب

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

کہتے ہیں کہ جس شخص کو غالب کی طرح روزِ سیاہ نصیب ہو تو وہ رات کو دن نہ کہے تو کیونکر بنے مگر یہ الٹی گنگا بہائی ہے جیسے روزِ بد۔ روزِ سیاہ کا سامنا ہو اُسکی آنکھوں میں تو روزِ روشن بھی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ دن کو رات سمجھنے لگتا ہے نہ یہ کہ رات کو دن کہنے لگے۔ اندھیرے کو اُجالا سمجھنے لگے۔ بعض اوقات شاعر کہنا چاہتا ہے کچھ اور

کہہ جاتا ہی کچھ اور اپنی دھن میں کچھ سوجھتا نہیں۔ غالب تو اس بات میں خاص طور پر بدنام ہیں۔ پہلے بھی ایک شعر اسی طرح کا بے معنی گذر چکا ہے۔ خود بینی کی جگہ آئینہ داری کہہ گئے جس سے شعر بے معنی ہو گیا۔ یہ شعر بھی ویسا ہی بے معنی ہی مگر ان بیوقوف شارحین کو دیکھیے کہ مہملاتِ غالب کو بھی بامعنی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ میاں نہا اس شعر کی جہلیت پر یہ کہکر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ کہ "روز سیاہ بدقسمتی سے تاریکی شب" کی لفظی توجیہہ ہے" بھلا اس جہالت اس بکواس اس ٹھوس ٹھانس کا کیا جواب ہے۔

شعر جیسا مہمل ویسی شرح بھی مہمل جیسی روح ویسے فرشتے ؎

ہاں شعر مگو کلام لایعنی را — در شعر و سخن رہ نبود اعنی را
طفلے است یتیم در کنارت معنی — لفظے باید کہ پرورد معنی را

غالب کو چوری کی اور بے معنی کہنے کی عادت ہے اسلئے اُن کی طرف گمان نیک ہی کرنا کوئی اخلاقی فرض نہیں ہے۔ اگر مقتضائے احتیاط گمان نیک ہی کیا جائے تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں کچھ تحریف ہو گئی ہے غالب نے کچھ اور کہا ہوگا۔ یہ تاویل شارحین کی طرف سے کیجاتی تو قابلِ سماعت ہو سکتی تھی مگر موجودہ شعر میں جس طرح معنی پہنانے کی کوششیں کی گئی ہیں وہ نہایت شرمناک ہیں۔ عرفی نے اسی مضمون کو کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے ؎

زفروغ آفتابم نبود خبر کہ بے تو — چو دو زلف تست یکساں شب و روزم از سیاہی!

غالب

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

واللہ میرزا غالب کا یہ شعر اتنا قیامت خیز ہے جس کا جواب نہیں ہم سخن سنج ہیں غالب کے
طرفدار نہیں شعر پڑھتے ہی بمبئی والی ممتاز بیگم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے مگر یہ شعر ہے کس کا ہر شخص
یہی کہیگا کہ غالب کا ہے۔ مگر نہیں غالب کے سوا ایک اور شخص کا بھی ہے کیونکہ History
of thoughts فیصلہ یہ ہے کہ اس شعر میں جو روح ہے اُس کا خالق غالب نہیں ہے شعر
کی روح یا خلاصہ تو یہ ہے کہ تم جس کے دوست ہوئے تو پھر اُسے دشمن کی ضرورت ہی نہیں
سو دشمنوں کے ایک دشمن تو تم ہو پیارے۔ واضح ہو کہ اس معنی کا خالق غالب نہیں ہے
بلکہ مولانا جمال الدین عبدالرزاق اصفہانی افضل فضلائے عجم ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ان راکہ توئی یار چہ بے یار کس است   واں راکہ توئی دوست چہ دشمن کام است

دیکھو بھئی ذرا ٹھہرو چھری تلے دم لو۔ گھبرا کر بول نہ اٹھنا کہ واہ غالب کا شعر بہت بلند ہے
میں بھی یہی کہونگا جو تم کہنے والے ہو مگر ابھی گفتگو فقط نفس مطلب سے صرف روح شعر سے ہے
وہ دونوں جگہ واحد ہے۔ غالب نے بھی وہی کہا ہے مگر پہلے مصرع میں دوست کی فتنہ انگیزی
کی طرف اشارہ کر کے شعر کو بہت ترقی دی ہے مگر تم خود اس کا اندازہ کر سکتے ہو کہ روح شعر
کا خالق کون ہے۔ نگاہ تحقیق غالب کو روح شعر کا خالق نہیں ٹھہرا سکتی۔ اب رہا شعر کا قالب
یعنی انداز بیان وغیرہ تو اسکے متعلق ہر ایک اندازہ لگا دیگا کہنے پہ مجبور ہے کہ جس اہتمام جس دھوم
دھام جس روانی و برجستگی سے غالب نے اپنے شعر کو مکمل کر دیا ہے (دوست کیا ہے فساد کی جڑ ہے
فتنہ ہے۔ آشوب ہے۔ بلا ہے۔ بندگان خدا کی خانہ ویرانی کا آلہ ہے) وہ بات مولانا جمال الدین
کے ہاں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ نفس مطلب کے لحاظ سے شعر کے مصنف اگر مولانا جمال الدین

ہیں تو باعتبارِ بیان و رنگ آمیزی غالب بھی برابر کے شریک ہیں غالب یہاں فقط مترجم نہیں بلکہ نیم مصنف کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ شعر کا اُردو قالب حُسنِ اتفاق سے اتنا پیارا اتنا دلکش بن گیا ہے کہ حسنِ معنی کو چار چاند لگ گئے۔ یہ شعر اُن لوگوں کے لئے (اور خود غالب کیلئے) بڑا سبق ہے جو مضامین کی بلندی و ندرت کی دُھن میں اندازِ بیان تازگی و دلکشی کی اہمیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں فقط بلندیٔ مضامین کو عین شاعری سمجھتے ہیں اندازِ بیان کی خوبیوں سے چشم پوشی کرنا اک کھلی ہوئی کمزوری ہے جنکی زبان کو یارائے بیان نہیں۔ جنہیں اعلیٰ درجہ کی قوتِ بیان نصیب نہیں وہ زبان کی خوبیوں کو کلام کا ایک عارضی حُسن ٹھہرا کر اپنی خلقی کمزوری اپنی کج مج زبانی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں مگر یاد رکھو مضامین کتنے ہی بلند ہوں اندازِ بیان سے آرٹ کا حق ادا نہیں کیا گیا تو شعر نہیں کلام موزوں ہے۔ دیکھو وہی مفہوم جو مولانا جمال الدین کے ہاں معمولی اور سُست الفاظ میں بیان ہوا تھا اُسی کو غالب کے زورِ بیان نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

غالب

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

شعر کی بندش ایسی پیچیدہ ہے کہ فر فر پڑھنا چاہو تو زبان الجھتی ہے۔ یہ شعر ناقص الخلقت کاٹ کے پھینک دینے کے قابل تھا مگر شارحین نے اس پر بھی وقت ضایع کیا شعر کی ہیئت کذائی چغلی کھا رہی ہے کہ شاید پرایا مال ہڑپ کر لیا گیا ہے۔ ہاں ایسا ہی ہے، نعمت خان عالی کے اک شعر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دریاب کہ ماندہ است زدل قطرۂ خونے　　آن قطرہ ہم از دست تو لبریز چکیدن!

کہنے والا اس صفائی سے کہہ گیا کہ اب بھی خبر لے کہ دل میں بس اک قطرۂ خون باقی رہ گیا ہے اور وہ بھی تیرے ہاتھوں ٹپک کر خاک میں مل جانے کو ہے بھلا لبریز چکیدن کی فصاحت و بلاغت کو باندازِ چکیدن سرنگوں "کیا پہنچ سکتا ہے۔ کھلی ہوئی چیز رہی

غالب

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجئے　　لئے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

اک دو چار ملکے سات ہوئے۔ سات آسمانوں کی رعایت کیا خوب طفلانہ صنعت ہے۔ ملا جامی سے

آسماں جامِ نگوں داں کز مئے عشرت تہی است　　جستن مے از تہی ساغر نشانِ ابلہی است

وہی آسماں۔ وہی جامِ واژگوں۔ وہی مے عشرت کی ہوس جو یہاں ہے سو وہاں۔ چوری نہیں تو کیا ہے؟

غالب

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

واہ واہ "ہستی کے مت فریب میں" یہ "مت" اُچک کر کہاں سے کہاں پہونچا ہے کسی دیہاتی کی زبان سے بھی ایسا بھونڈا جملہ کم نکلا ہوگا۔ غالب کے فلسفہ کا ڈھنڈھورا تو بہت پیٹا جاتا ہے مگر یہ کتنا فرسودہ فلسفہ ہے۔ اندازِ بیان میں بھی کوئی تازگی نہیں اک گنوار بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ یہ سارا سنسار محض دھوکے کی ٹٹی ہے مایا ہے فریبِ نظر ہے۔ پرانی باتیں میں مزہ بھی پیدا ہو سکتا ہے جب طرزِ استدلال و اندازِ بیان

میں کچھ تازگی ہو۔ مگر یہاں تازگی تو کجا "ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ" نے لُٹیا ڈبو دی۔ اس بوالعجبی کا کیا ٹھیک ہے کہ میرزا عبدالرحمان بیگ چغتائی نے ایسے بھونڈے شعر کی تصویر بنا کر بڑے فخر کے ساتھ مرقعِ چغتائی میں شایع کی ہے۔ دیکھیے اسی فلسفہ کو خدائے سخن میرؔ نے کس سادگی سے بیان کر دیا ہے ؎

یہ توہم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اس سہل ممتنع پر قدرت پانا غالبؔ کے بس کی بات نہیں ہے۔ اتنا سادہ اتنا مکمل کہ کوئی نقطہ نہ لگا سکے۔

غالب

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے　　کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

شعر کچھ نیا سا معلوم ہوتا ہے مگر نیا ہے نہیں۔ نظیریؔ کے شعر سے اُڑا لیا گیا ہے ؎

حال ما شہرہ بانشائے غزل ساختت دریغ　　ماند در سینہ ز رخ پردہ برانداختت دریغ

غالب

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے　　گرچہ ہے کس کس برائی سے ولی بایں ہمہ

مشہور و معروف شعر ہے مگر چوری کا مال ہے۔ شرف قزوینی کہتا ہے ؎

چوں بایں تقریب می آرد بیاد او مرا　　ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا

غالب

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی　　بُوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی

معمولی سا شعر ہے۔ صائبؔ کے شعر سے ماخوذ ہے ؎

زین پیش شغل عشق نجاماں نمی رسید　　　در روزگارِ حُسن تو ایں شیوہ عام شد

غالب

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

زبان کی ایسی غلطی بچوں سے بھی نہیں ہوتی۔ روزمرہ تو ہے "ہمیں خود اپنی خبر نہیں" "ہمیں ہماری خبر نہیں" شاید دیہاتی بھی نہ بولے گا مگر بندۂ ضرورت کیا کرے "اپنی" سے وزن پورا نہیں ہوتا تھا۔ "ہماری" کہہ دیا۔ روزمرہ گیا بھاڑ میں۔ یہ مضمون بھی بہت پامال ہے مگر شاعر حقیقی، پامال مضامین کو بھی اپنے طرزِ بیان سے آسمان پر پہونچا دیتا ہے۔ دیکھو میر نے کیا کمال دکھایا ہے ؎

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو　　　دیر سے انتظار ہے اپنا

جل جلالہ "دیر سے انتظار ہے اپنا" یہ وہ الہامی اندازِ بیان ہے کہ شاعروں کے سوا پیغمبروں کو بھی نہیں ملا۔

غالب

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے　　　نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

لاادری

جنت نہ شود چارۂ افسردگی دل　　　تعمیر باندازۂ ویرانی ما نیست

غالب سا آسانی دیتا اور ایسی خطرناک چوری۔ کہاں ہیں غالب کے دلچسپے۔ گریبان میں منھ ڈالیں۔

غالب

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　　جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

شعر بجائے خود مکمل ہے۔ جامِ جم پر جامِ سفالیں کی ترجیح نہایت لطیف ہے خدا کرے یہ شعر غالب ہی کا ہو۔ کسی کی نقل نہ ہو۔

غالب

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فغانی تبریزی

با دو چو می رسم آسودہ می شوم از دُور ۔۔۔ ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف

غالب کا یہ شعر بھی نہایت مکمل ہے۔ فغانی نے جس مشاہدہ کو قلمبند کیا ہے غالب نے اُسی کو کمال شعریت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ یہاں تک تو غالب کی جائز تعریف ہے۔ اگر اس سے آگے بڑھے شعر کو اچھوتا اور original کہا تو اچھا نہ ہوگا!

غالب

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا ۔۔۔ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

میر مظہر نظرت کے شعر سے مضمون اُڑایا ہے ؎

ہر عضو من ز دست تو دارد شکایتے ۔۔۔ چوں ارغنوں لبالبم از نالہائے زار

غالب

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے ۔۔۔ ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

خوش آئی بمعنی پسند آئی خدا جانے کہاں کی اُردو ہے۔ یہ شعر بھی بیدل کے شعر کی بگڑی ہوئی شکل ہے

ز جیب ہر مژہ آغوش می چکد ایں جا ۔۔۔ بیا کہ جائے تو در چشم دوستان خالی است!

غالب

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

نہایت لطیف شعر ہے مگر تغافل میں نگاہ کا پایا جانا پرانا مضمون ہے۔ ظہوری کہتا ہے۔

تو نظر باز نئی ورنہ تغافل نگہ است　　تو زبان فہم نئی ورنہ خموشی سخن است

غالب

نہ ہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب　　کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ملا میلی مشہدی سے مضمون اڑایا ہے ۔

دارد خموش تامن حسرت کشیدہ را　　گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

غالب

زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے　　کشاد و بست مژہ سیلی ندامت ہے

یہ کوئی شعر نہیں ہے۔ بیدل کے شعر کے مقابلہ میں گدڑی گانٹھی ہے۔ بیدل ۔

دیدہ راکہ بہ نظارہ دل محرم نیست　　مژہ باہم زدن از دست ندامت کم نیست

غالب

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد　　جنون ساختہ و فصل گل قیامت ہے

میر صیدی طہرانی

چہ بہرہ از گل رویش ہوس گداختہ را　　بہار فیض نہ بخشد جنون ساختہ را

ہائے کیا غارت کیا ہے میر صیدی کے شعر کو۔ صیدی کہتا ہے کہ جب شخص میں حرص ہوس

تک باقی نہ رہی اُسے بہار حُسن کیا جوش میں لا سکے گی۔ حسن کا جادو تو اُسی پر چل سکتا ہے جس کا دل زندہ ہو۔ موسم بہار کی ہوا اُسی کو دیوانہ بنا سکتی ہے جس میں آتش جنونانہ دبی دبائی موجود ہو۔ بھلا کوئی مصنوعی دیوانہ، بہار سے کیا فیض پا سکتا ہے۔ کس قیامت کا شعر اور انداز بیان کتنا تازہ و لطیف۔ جنوں ساختہ اور ہوس گداختہ قوت اختراعی کے کتنے نادر نمونے ہیں۔ اس کے سامنے غالب نے شعر کیا کہا ہے منھ چڑھایا ہی کس دیہاتی انداز سے فرماتے ہیں (وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد) اب اس کے معنی بھی بتا دوں۔ غالب کی اُردو ہے کوئی کھیل نہیں ہے۔ وفا مقابل ہے کیا معنی کہ معشوق وفادار وفا کرنے کیلئے سامنے کھڑا ہے مگر عاشق کا عشق ٹیں ٹیں ہے۔ اس میں عشق کا جوہر ہی نہیں۔ خالی ہے۔ تو اسکی مثال ایسی ہی کہ جیسے جنوں ساختہ اور فصل گل یعنی فصلِ بہار تو جوش پر۔ مگر عاشق کا جنون عشق سچا نہیں رہے مصنوعی ہے۔ مضمون اڑانا چاہا مگر دیہاتی زبان کیا کام دے سکتی۔ میر صیدی کا شعر کمال شعریت کا نمونہ ہے۔ اک اُلو کا پٹھا مولوی ٹھینگا موہانی غالب کے اس دہقانی شعر پر بھی (جو نہایت شرمناک چوری ہے) سر دھنتا تھا۔ آدمیان گم شدند۔

غالب

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

معمولی شعر ہے کوئی تازگی نہیں۔ عرفی کہتا ہے ؎

بیار بادہ کہ جانم دمے زنالہ برآید ہزار زمزمہ از دل بہ یک پیالہ برآید

غالب

خوش ہوتے ہیں پہ وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

نہایت تازہ شعر معلوم ہوتا ہے۔ شب ہجر میں موت کی دعا مانگا کرتے تھے قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی دعا آگے آئی شب وصل میں شادی مرگ ہو گئی۔ غالب کے بہتیرے مایہ ناز اشعار میں سرقہ ثابت ہو چکا ہے اس وجہ سے بدگمانی ہوتی ہے کہ یہ بھی کہیں پرایا مال نہ ہو۔

غالب

نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

یہ "جس کو کہ" کیا بُرا معلوم ہوتا ہے "کہ" محض حشو قبیح ہے۔ یہ شعر بھی چوری کا مال ہے

سرت گردم بزن تیغ دگرے بر رُوئے دل بکشا دلم تنگ است وکار از زخم پیکاں بر نمی آید

غالب

نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کف خاک آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

بیدل

ہیچ پرواز زخاکستر خود بالا نیست بیدل ایں ہفت فلک بیضۂ یک فاختہ است

بیدل نے جو کچھ کہنا چاہا صفائی سے کہہ گئے یعنی آسمان تک اُڑ کے پہونچنا کوئی بڑی بلند پروازی نہیں ہے کیونکہ آسمان کی یہ بلندی یہ وسعت بس دیکھنے ہی کی ہے اُسکی حقیقت تو بس اتنی ہے جیسے فاختہ کا انڈا۔ تحقیر کی راہ سے آسمان کو فاختہ کا انڈا کہا ہے یعنی بے حقیقت ہے اسلئے فلک تک پرواز کر جانا کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ البتہ اپنے قالب خاکی سے پرواز کر جانا خودی سے گذر جانا بڑی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کا مصرع

(آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے) سراسر بیدل کے مصرع کی چوری ہے۔ خیر اپنا مصرع
لیکر کچھ اپنی فکر کے جوہر دکھاتے مگر اس چرائے ہوئے مصرع پر مصرع لگاکر جو شعر
گانٹھا ہے (نالہ سرمایہ یک عالم و عالم کف خاک الخ) اس کے معنی غالب ہی سمجھتے
ہوں گے۔ مانا کہ غالب کا کلام سمجھ لینا آسان نہیں ہے کیونکہ وہ ٹھہرے آسمانی شاعر
مگر ہم ایسے تو کودن نہیں ہیں کہ سمجھانے سے بھی شعر سمجھ میں نہ آئے۔ اس شعر کی شارحین
نے جو اوٹ پٹانگ شرحیں لکھی ہیں ان سب کو پڑھ جانے کے بعد کوئی مطلب یاد نہ رہ سکا
آج بھی ہم اس کے معنی بتا نہیں سکتے۔ تو کیا واقعی ہم اتنے کودن ہیں؟ جی نہیں
شعر ہی ناقص ہے بے معنی ہے کہ سمجھانے کے بعد بھی معنی و مطالب ذہن میں نہیں ٹھہرتے
دیوان غالب میں کوئی سائینس کے عجائبات تو درج ہیں نہیں کہ جب تک
سائنس کے اصول معلوم نہ ہوں عجائبات سائینس کی سمجھ میں نہ آسکے افسوس
ہے کہ بیدل کا مصرع چرا لینے کے بعد بھی غالب نے کوئی معقول فائدہ اٹھانے
کا ثبوت نہ دیا۔

غالب

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

شعر اپنی حدود میں پورا ہے زبان زد خاص و عام ہے مگر پرایا مال ہے۔

عاقل خاں رازی کہتا ہے ؎

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا — اوّل این حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

غالب

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

خوب شعر ہے مگر original نہیں ہے۔ کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے سہ

زیں نام چو تر کنم زباں را　　جاں بوسہ دہد سرِ زباں را

غالب

تھا موجد عشق بھی قیامت کوئی　　لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکل

اس مضمون کو میر تقی میر خوب فرما گئے ہیں سہ

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر　　مذہبِ عشق اختیار کیا

غالب

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا　　قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

عرفی

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در جیحون عشق　　روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

اس امر سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غالب کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ بھی غالب کا نہیں ہے عرفی ہی کے مصرع کو پلٹ دیا ہے۔ مگر غالب کا ایک چھٹا موٹی ٹھینگا موہانی کس ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ "در بلا بودن بہ از بیم بلا" سے مصرع لگا کر غالب عرفی سے بھی گویا پانچ قدم آگے نکل گیا ہے۔ مگر میں ابھی جھوٹے کو گھر تک پہونچائے دیتا ہوں۔

ارے میاں پرائے مال میں تصرف کرنے کا مزہ تو جب تھا کہ عرفی کا مصرع لیکر پہلا مصرع خود بدولت مرزا غالب ہی نے لگایا ہوتا مگر غضب تو یہ ہے کہ پہلا مصرع بھی غالب کا نہیں ہے میرزا صائب کا ہے منھ پیٹو یار و منھ پیٹو۔ صائب سے

بکش در زندگی مردانہ جام نیستی بر سر   کہ باشد در بلا بودن بہ از بیم بلا بودن

اہا ہا۔ پہلا مصرع صائب کا دوسرا عُرفی کا اور تعریفیں چچا غالب کی اس بلند آہنگی کے ساتھ۔ کیا کہنا اس ڈھٹائی کا۔ ڈوب مرتے یار و تو اچھا تھا۔ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔ ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی؟

اچھا اب کچھ پھڑکتی ہوئی رباعیاں بھی سنا دوں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ سُنیئے اور سر دُھنیئے۔

راقم ارقم

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار لاتور دکن

میٹھی میٹھی چٹکیاں

(۱)

کیا اُسّتِ غالب میں پیا ہے فرہاد

مرزا کے بت پہ آہ ایسی افتاد

ہنس ہنس کے جلا جلا کے کہتے ہو جہاد

کیا کہتے نہیں داد ہاتھ لا نا اُستاد

(۲)

مالا جپنے لگا ہے بڈھو گھر گھر

کلمہ پڑھنے لگا ہے مٹھو گھر گھر

ٹیاں بھی ہے حافظِ کلامِ غالب

مرزا کا بولتا ہے اُلّو گھر گھر

(۲۹)

غالب کو میر سے بڑھانے والے
چوروں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبینگے
دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

(۳۰)

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سُنے
نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سُنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر
غالب سے بچا چور نہ دیکھے نہ سُنے

(۵)

ہاں میرؔ سے اعجاز بیانی سیکھی گویا تلوار کی روانی سیکھی

اور "قاطع برہان" سے کیا فیض ملا غالبؔ کی طرح بدزبانی سیکھی

(۶)

بھونڈا پن ہی مذاقِ غالبؔ میں رچا مرزا کا کمال اپنی نظر میں نہ جچا

محفل میں ہوا بے رنگِ یگانہؔ غالب وہ کون یگانہ؟ وہی غالبؔ کے چچا!

(۷)

وہ جاتے ہیں میرزا یگانہؔ وہ دیکھ میدانِ سخن کے مرد یکتا وہ دیکھ

غالبؔ کے پٹیت۔ دشمنِ جانِ ادب وہ کان لئے جاتا ہی کوا وہ دیکھ

(۸)

شاعر تو ہیں بہتیرے مگر بہروپ ہیں کچھ ان میں ہیں خاموش کچھ چرب ہیں

غالبؔ غالبؔ ارے کہاں کے غالبؔ غالبؔ کے چچا کے آگے سب ڈھنڈس ہیں

(۹)

پنجاب سے سیکھ آئے ہو کیا خوب ہنر — غالب کا نہ غالب کے سگوں کا کچھ ڈر

ایسے کبھی منھ سے پھول جھڑتے تو نہ تھے — اوگلی بکتے ہو کیا مزے لے لیکر!

(۱۰)

شاباش ارے واہ مرے جنگلی بدھو — ہر شہر میں بولتا ہے تیرا الو

قرآن میں یا وید میں کیا رکھا ہے؟ — غالب کا دیوان پڑھے جا مٹھو

(۱۱)

اب کون مناتا ہے قرآن کی خیر — ہاں چاہیئے چار جز کے دیوان کی خیر

غالب پہ جو ایمان نہ لائے کافر — پھر جان کی خیر ہے نہ ایمان کی خیر

(۱۲)

ڈوبے تو بہت ہونگے تِرے کم ہونگے — اِس طرح کے طوفاں میں گھِرے کم ہونگے

لو سنگِ ملامت سی ہوئی اور بھی سخت — ایسے تو یگانہ سر پھرے کم ہونگے!

(۱۳)

تقلید کا بندہ نہیں خود سر ہوں میں
واللہ اک آزاد سخنور ہوں میں

وہ موج نہیں ہوں جیسے ساحل روکے
دھارا ہوں آج کل سمندر ہوں میں

(۱۴)

غالبؔ تو ہے دنیا سے نرالا صوفی
مانگے ہے روز تر نوالہ صوفی

"میٹھا ہو بہت سا ہو" کہ تنکر کھائے
کون ایسا ہے "آم" کھانے والا صوفی

(۱۵)

پیری میں بھی ہے مزاج رندانہ وہی
ساقی وہی شیشہ وہی پیمانہ وہی

دلی تو ہے تخت و تاج کے ماتم میں
مرزا کی ہے گفتگو ظریفانہ وہی

(۱۶)

شہزادے بڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے

واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
غالبؔ کے وطن پرست کہنے والے

(۱۷)

ایسے گستردہ ہوس، کم ہونگے ایسے پابند بیش وپس کم ہونگے

اڑتے ہیں مگر اڑ نہیں سکتے واللہ غالبؔ کے ایسے کتنے ٹھس کم ہونگے

(۱۸)

کیا جانیں ادھورا ہے کہ پورا شاعر جب منہ میں زبان نہیں تو کیسا شاعر

سچ کہتے ہیں میرزا یگانہ صاحب غالبؔ سا نہ ہوگا کوئی گونگا شاعر

(۱۹)

غالبؔ کے سوا کوئی بشر ہے کہ نہیں؟ اوروں کی بھی حصہ میں ہنر ہے کہ نہیں؟

مُردہ بھیڑوں کو پُوجتا ہے ناداں زندہ شیروں کی کچھ خبر ہے کہ نہیں؟

(۲۰)

چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں رچا مجھ سے جو تنے تو منہ کی کھاؤ گے بچا

غالبؔ کو چچا بنا کے چھوڑا ہیں نے غالبؔ میرے چچا ہیں غالبؔ کا چچا

له آپ اپنی نگاہوں میں بُرا وہ ہے جو یہ کہے سے "نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی!"

(۳۳)

کس سے کہوں کیا ہوئیں اے واہ کہیں
آفت ہوں بلا ہوئیں اے واہ ری میں
بھاری ہے بڑے بڑوں پہ مُردہ اپنا
غالب کا چچا ہوئیں اے واہ ری میں

(۳۴)

استادوں کے ساتھ دل لگی سوجھتی ہے
نشے میں خودی کے دُور کی سُوجھتی ہے
غالب کے چچا ہے ہو ماشاء اللہ
جو سوجھتی ہے یار نئی سوجھتی ہے

(۲۵)

فانوسِ خودی میں آپ مستور ہیں ہم
پردہ یہ اُٹھے تو نور ہی نور ہیں ہم
دیکھا تو یہی تو نے مگر کیا دیکھا؟
جتنے نزدیک اتنے ہی دُور ہیں ہم

(۲۶)

بدبیں کی نظر سے کیوں الٹا دیکھوں
سچ مچ جیسا ہوں کیوں نہ ویسا دیکھوں
آنکھیں اپنی ہیں اور جلوہ اپنا
آئینہ پرائی آنکھ سے کیا دیکھوں؟

(۲۷)
غالب بھی ہے واللہ انوکھا صوفی
انگریز کے دربار کا جھوٹا صوفی
پنشن جو ہوئی بند تو بھوک اور کھلی
ہے ایسا کوئی پیٹ کا بندہ صوفی
(۲۸)
اللہ ری ہوا و ہوس خلعت و زر
مرزا کا ہے سر اور انگریز کا در
ہاں کیوں نہوں مُورکھوں کے دیوتا غالب
ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پرمیشر!

(۲۹)

کیوں کیا ہوئے وہ بہادری کے جوہر؟

سمجھو پشتوں کی سپہگری کے جوہر!

پشتن نے کیسے دل سے کلمہ نکلا

دکھلائے ہیں کیسے شاعری کے جوہر؟

(۳۰)

اک شاعر کہنہ سال کہہ سکتے ہو

پیسے کا شریک حال کہہ سکتے ہو

جو چاہو کہو یار مگر یہ نہ کہو

غالب کا ہم خیال کہہ سکتے ہو

(۱)

خاصہ نہ سہی بلا سے گھر چھن ہی بہت
تن ڈھکنے کو صاحب کا اتارن ہی بہت
دلی کا تخت الٹ گیا ٹھینگے سے
نوشہ کیلئے خلعت و پنشن ہی بہت

(۲)

تلوار سے مطلب ہے نہ کھانڈے سے غرض
مومن کی سر و کار نہ ٹانڈے سے غرض
رنگون میں دم توڑتا ہے شاہ ظفر
غالب کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

میرزا یگانہ چنگیزی
لکھنوی

کارنامہ

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

(۱) آیاتِ وجدانی - فلسفیانہ و وجدانی غزل سرائی کا وجد انگیز و لازوال کارنامہ غزل گوئی کا معیار جدید - قیمت ڈو روپے

(۲) ترانہ - مجموعۂ رباعیات یگانہ - جس میں فلسفۂ حیات کے بڑے بڑے حقائق پر حیرت انگیز سادگی و برجستگی - انتہائی شاعرانہ و فلسفیانہ قوت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے - جس پر عمر خیام کی چھاؤں تک نہیں پڑی - خود مصنف کی انفرادی شان کا مرقع ہے - اردو میں جس کا جواب نہیں - قیمت ایکروپیہ چار آنہ

(۳) غالب شکن - اسم با مسمیٰ - جس نے غالب پرستی کا بنا بنایا گھروندا بگاڑ دیا قیمت پانچ آنے -

(۴) خرافاتِ عزیز - اک تنقیدی شاہکار ہے قیمت چار آنہ -

(۵) چراغِ سخن - علم عروض کا مستند اور کارآمد رسالہ - قیمت بارہ آنے -

ملنے کا پتہ

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

سب رجسٹرار لاتور (دکن)

(آرمی پریس دیال باغ آگرہ)